آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2019

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 4 اپریل 2019

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	میرابائی کی شاعری کا سماجی اور مذہبی مطالعہ	شاہد ماہلی	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہان نسواں	ابوالکلام آزاد اور تعلیم نسواں	ڈاکٹر جاں نثار معین	9
	ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی صورتحال	معصوم زہرہ	12
	اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات	محمد سرور لون	15
	خواتین کی پسماندگی: اسباب اور تدارک	امان اللہ	20
	جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناول	صبا انجم	23
	حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں بچوں کے مسائل کی عکاسی	ثنا غزل	29
کہانیاں	ہیرا کس کا؟	شیریں نیازی	34
	دادی گیری	سلمیٰ حجاب	37
	اگنی پریکشا	شاہدہ شاہین	41
	فیصلے کا حق	محمد حنیف خان	45
حسن سخن	ادا جعفری، گلشن بانو وفا		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	سورج کی کرنوں کی شفابخش قوت	حسن الدین احمد، غلام احمد	54
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

خواتین کے بیشتر مسائل سے متعلق ہم گذشتہ کئی اداریوں میں بات کر چکے ہیں جیسے خواتین کیا سوچتی ہیں، ان کی تعلیم کا معیار کیا ہو، انھیں خود مختار کیسے بنایا جائے؟ لیکن کیا محض بات چیت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین اپنے مسائل کے تئیں خود بیدار ہوں اور وہ خود اپنے لیے ماحول تیار کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے کی خواتین بہت فعال ہیں لیکن فرسودہ روایات ہنوز ان کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔ اس لیے بے جا روایتوں کے بندھن سے آزاد ہو کر خواتین کو ایسی فضا ہموار کرنی ہوگی جو خود ان کے اور معاشرے کے لیے بہتر ہو۔

معاشرتی سطح پر ہر روز نئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ تبدیلی کے ساتھ ساتھ کچھ نئے مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا حل ہم تلاش بھی کر لیتے ہیں تاہم کچھ مسائل ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی تدارک نظر نہیں آتا۔ جب ہم معاشرتی سطح پر خواتین کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج بھی خواتین کے سامنے کئی اہم اور بنیادی مسئلے موجود ہیں۔ مثلاً شہروں کے مقابلے دیہی علاقوں میں خواتین کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ ان علاقوں میں عورت جبر و استحصال کا شکار ہے۔ حکومت کو اس ضمن میں بھی سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ صرف ویمنس ڈے منانے پر ہم اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ عملی طور پر حکومت اور خود ہمیں ان کے مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ بات صرف دیہی علاقوں کی خواتین تک محدود نہیں بلکہ پورے طبقۂ نسواں کے جو مسائل پہلے سے موجود تھے وہ آج بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں بلکہ ان مسائل میں اور اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایسے میں حقوق نسواں کا نعرہ بے معنی سا لگتا ہے۔ جب تک طبقۂ نسواں کے تمام مسائل حل نہیں ہو جاتے تب تک ہمیں خاموشی سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی معاشرے کو تنزلی کی طرف لے جاسکتی ہے اور معاشرے کی تنزلی گویا ملک و قوم کی تنزلی ہوگی۔

خواتین شاعرات میں میرا بائی کو ہم اکثر فراموش کر جاتے ہیں۔ ان کا ذکر ہمیں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے بھکتی شاعری کے ذریعے ایک سنجیدہ طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ میرا بائی کی شاعری میں جذبات اور احساسات کی شدت ہے۔ انھوں نے اپنے پربھو 'گردھر ناگر' کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کر دی۔ اپنے خیالات کا اظہار انھوں نے عوامی زبان میں عوام کے بیچ رہ کر کیا۔ ان کی شاعری عوام اور خواص دونوں کے لیے ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ کرشن جی بھگوان کا اوتار ہیں۔ میرا بائی کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ انھیں دن رات، اٹھتے بیٹھتے اپنے کرشن کا ہی دھیان رہتا تھا۔ میرا بائی کی شاعری میں ایک درس ہے، ایک پیغام ہے۔ ہمیں میرا بائی کی شخصیت اور ان کی شاعری سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس شمارہ میں میرا بائی کی شاعری پر ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔

خواتین میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ انھیں ذہن سازی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی رہنمائی صحیح طریقے سے کی جائے تو وہ کامیابی کی کئی منزلیں بہ آسانی طے کر سکتی ہیں۔ اپنا، خاندان اور ملک کا نام روشن کر سکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں صحیح پلیٹ فارم مہیا کرایا جائے۔ انھیں لکھنے، پڑھنے، بولنے اور زندگی کے فیصلے خود لینے کی آزادی دی جائے۔ تبھی ہم ان کے ساتھ انصاف کر سکیں گے۔

قومی اردو کونسل اردو زبان کو گھر گھر تک پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ ہم اردو زبان کے چاہنے والوں سے یہ التماس کرتے ہیں کہ وہ اردو زبان خود بھی پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں۔ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اپنے تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کیجیے گا۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شاہد ماہلی

میرابائی کی شاعری کا سماجی اور تہذیبی مطالعہ

میرابائی کے کوائف، حیات اور ان کے شعری کارناموں پر تاریخ اور شعروادب کے محققین نے روشنی ڈالی ہے اور ایسے نکات کی نشاندہی کی ہے کہ موجودہ دور میں میرا کی شاعری کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ میرا کی مقبولیت اور شہرت ہندوستان کی سرحدیں پار کرگئی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں میرا کی شاعری کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں بھگتی سب سے اہم رجحان تھا اور بھگتی شاعری کا ایک بڑا نام میرابائی تھا۔ میرا نے اپنے پربھو 'گردھار ناگر' کی عقیدت مندی میں جن اصناف کا تخلیقی استعمال کیا ہے اس میں پداولی، بھجن، ہری جس وغیرہ مختلف نام شامل ہیں۔ میرا کی شاعری زبانی اور تحریری دونوں شکلوں میں ملتی ہے۔ سینکڑوں برسوں میں میرا کی شاعری سینہ بہ سینہ محفوظ رہی ہے مگر اب اسے تحریری طور پر بھی محفوظ کرلیا گیا ہے۔ میرا کی شاعری کا مختلف سطحوں پر مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کچھ نقادوں نے ان کی شاعری کے تاریخی پس منظر پر زور دیا ہے، کچھ نے انھیں مذہبی روپ میں دیکھا ہے اور کچھ نقادوں نے صرف ادبی پہلو کو ملحوظ رکھ کر مطالعہ کیا ہے۔

میرابائی کی شاعری کی ایک سطح مذہبی جذبات خلوص وعقیدت پر مبنی ہے تو دوسری طرف اس میں عوامی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ عوام کے بیچ رہ کر عقیدت مندی یا بھگتی کو پیش کرتے وقت میرا کو دنیاوی یا عوامی رجحانات سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی پیشکش وگفتار دنیاوی ہیں اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ ترسیل وابلاغ کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں، لیکن جذبات و افکارات الوہی ہیں۔ میرا کی شاعری میں سیاسی، مذہبی، سماجی اور تہذیبی ماحول، عوامی عقیدتیں، دنیاوی رجحانات ظاہر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ عام بول چال کے الفاظ اور مقامی بولیوں ٹھولیوں کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس دور کی آمدورفت اور تفریح کے طریقہ کار، رسم ورواج، خوردونوش، لباس، یہاں تک کہ عوامی اندازِ فکر اور سماج کے رشتوں کا اظہار میرا کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مختصر یہ کہ میرا کی شاعری ان کے عہد کا تہذیبی منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ان کا عہد جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس خاندان اور سماج میں میرا پروان چڑھیں، جس ماحول نے ان کی پرورش میں نمایاں رول ادا کیا ہے اسے وہ کیسے نظرانداز کرسکتی تھیں۔ کیونکہ میرا تو اپنے دور کی پیداوار تھیں۔ ویسے بھی ادب اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے اور میرا ایک عظیم فنکار تھیں، ان کے کلام میں یہ تمام چیزیں مترشح ہونا لازمی تھیں۔

پھر عوامی زندگی کے جن اشیا کا استعمال اور رواج ہوتا ہے، جس طرح کے عادات واطوار ہوتے ہیں، جیسی زبان وادب ہوتا ہے، جس طرح کے رسم و رواج، لباس اور زیورات اور تیوہار ہوتے ہیں، ان کا بیان تہذیبی مطالعہ کہلاتا ہے۔ ہندوستانی خواتین میں زیورات پہننے کا رواج بہت پرانا ہے۔ پرانے زمانے سے بارہ طرح کے زیورات کا چلن ہے، جیسے نوپور، کنکوی، انگوٹھی، کنگن، ہار، ٹیکہ وغیرہ۔ میرا کے عہد میں عورت مرد، یہاں تک کہ جانوروں کو بھی پوشاک وزیورات پہنانے کا رواج تھا۔ ہر طبقے کی پوشاک اور زیورات الگ الگ تھے۔ کسی مخصوص ذات کو ان کے لباس اور زیورات سے پہچانا جاسکتا تھا۔ خاص طور پر ہیرے پنّے سے لے کر سونا چاندی اور تانبے پیتل تک کے زیورات اس دور کے سماج میں مستعمل تھے۔ میرا کی شاعری میں جا بجا لباسوں اور زیورات کا ذکر ہوا ہے، اسی طرح خواتین کے سنگھار کا اظہار ان کی شاعری میں بار بار ملتا ہے۔ بارہ زیورات کی طرح سولہ سنگھار کا ذکر بھی کلاسیکی ادب کا امتیازی پہلو ہے۔ ماتھے پر بندیا، آنکھوں میں کاجل اور موتیوں سے مانگ بھر کر سنگھار کرنا میرا کے عہد میں بھی عام تھا۔ جس کا ذکر میرا کے یہاں بار بار ملتا ہے۔ میرا کی بھگتی کا محور ومرکز شری کرشن تھے۔ اس لیے ان کی شاعری رادھا، گوپیاں، بنسی، جمناتٹ وغیرہ سے بجی سنوری ہے۔ کھیل، کود، موسیقی، رقص، تیوہار، موسم، جانور، پرندے وغیرہ کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ بارہ ماسہ جیسے ساون، بھادو وغیرہ کا ذکر، میرا کی شاعری میں خماری پیدا کر دیتا ہے۔ بادلوں کی حرکی تصویر کشی کالیداس کی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح پھل، پھول، پیڑ پودے، قدرت کے نظارے بھی دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

میرا بائی کی شاعری میں عہد وسطیٰ کی سماجی زندگی اور اس کے تقاضوں کی دلکش جھلک ملتی ہے۔ عام خاندانی زندگی سے لے کر شاہی خاندان کا طریقۂ کار، تنظیم وغیرہ کا تعارف میرا کے یہاں ملتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مشترکہ خاندان کا رواج تھا، چونکہ مشترکہ خاندان میں بہت سی کمزوریاں آگئی تھیں، جن کی طرف میرا نے اپنی شاعری میں بھرپور اشارے کیے ہیں۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان بالخصوص راجستھان میں مذہب کا بول بالا تھا۔ مذہب کی گرفت اور اثرات عام آدمی پر بھی خاصے مضبوط تھے، میرا کی شاعری اس کی گواہ ہے۔ میرا کی جائے پیدائش میٹرتا میں مذہبیت کہیں زیادہ تھی۔ ذات پات کا رواج بھی تھا۔ میرا ان رسم ورواجوں سے الگ نہیں تھیں۔ اس زمانہ میں شادی بیاہ کی رسمیں، بیوہ اور اس کی شادی، جوہر اور ستی کا رواج جیسے سماجی مسائل سے وہ بھی متاثر تھیں۔

بھگتی عہد کا ادب، عوامی زبان کا ادب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میرا کی شاعری میں مقامی الفاظ کہاوتوں اور محاوروں کا استعمال بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ راجستھان کی سرزمیں سے تعلق رکھنے والی یہ شاعرہ ہماری ہندوستانی تہذیب کا شاہکار ہے۔ میرا نے ایسے ماحول میں شاعری کی جس ماحول میں بڑے سے بڑے سورماؤں کی تلوار کی گھن گرج پورے سماج میں سنائی دے رہی تھی اور ایسے ماحول میں میرا کی بھگتی شاعری راجستھان کے لیے فخر اور ناز کی علامت بن گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ میرا کی شاعری اور زندگی دونوں بھگتی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہندی ادب میں ان کی شاعری اور نام پر کافی اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ میواڑ اور مارواڑ جیسے تاریخی مقامات میں میرا کا کوئی ذکر تاریخ میں نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے کئی واقعات اب بھی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں،

جو اگر سامنے آ جاتے تو میرا کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے میں اور زیادہ آسانی ہوتی۔ اپنی شاعری میں شری کرشن جی کے ساتھ جوان کا لگاؤ تھا، وہ برابر کرتی رہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی
جا کے سر مور مکٹ میرو پتی سوئی
گردھر میرو سانچو پتی ہے
میرا کے پربھو گردھر ناگر گھروپایو پورو
گردھر ہاتھی بکائی

تو دوسری طرف وہ کہتی ہیں:

نکھ پر گرؤ ردھارے بنشی بجاون
جا کر کر پا کرونندن تا کے صدا سہائے ہے
بلکو چھلنی چلے بھیکھ دھرے بھاؤنا
متھرا کا کنس پچھاڑے لنکا پتی راون

شری کرشن جی سے ان کا حقیقی جذبۂ عشق کا یہ عالم تھا کہ جس طرح اپنے شوہر کی محبت میں ڈوبی ہوئی عورت خواب میں بھی کسی دوسرے مرد کو نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح شری کرشن کی یہ بھگت اپنے خواب تک میں کسی دوسرے دیو(देव) کو بالکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ شری کرشن سے میرا کی عقیدت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان کی دیوانی ہیں اور کرشن ہی ان کے سب کچھ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف شکل میں دنیا میں حق وصداقت کے نمائندے بن کر آئے۔ جنھوں نے بنسی بجا کر کبھی گائے چرائی، کبھی ماکھن، کبھی گوپیوں کے کپڑے چرائے کبھی راس رچائے اور اس طرح اپنے مخصوص انداز سے مخلوق کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ بھگوان کا وہ روپ تھے جنھوں نے رام کا اوتار لے کر، راون کا اور کرشن کا اوتار لے کر کنس کا خاتمہ کیا اور دنیا کو بد اور شر سے بچایا اور جن کو میرا نے اپنا سب کچھ ارپن کر دیا اور امر پریم کی مثال قائم کی۔

(میرا: شخصیت اور فن، مرتبہ ڈاکٹر ثروت خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنہ اشاعت: 2009)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................. بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C ،IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

شیشے سے زیادہ جو نازک تھا مرے ہمدم
تم نے بھی اسی دل پر اک ٹھیس لگا دی ہے

فرقت میں تری ہم نے اشکوں کے چراغوں سے
کچھ اور شبِ غم کی توقیر بڑھا دی ہے

ریحانہ عاطف

مرہم وقت تو بے سود ہے کچھ اور علاج
زخم دل روز پنپتا ہے ، ہرا ہوتا ہے

ہاں وہی جن سے کئی بار مسیحائی ہوئی
ساغرِ سم انہی ہاتھوں سے عطا ہوتا ہے

نزہت صدیقی

سنگ ترے جب چلتی ہوں تو سب کچھ اچھا لگتا ہے
اتنا بتا دے مجھ کو دلبر تجھ کو کیسا لگتا ہے

تیرے رہنے تک ہی دل میں خوشیوں کا تھا شور بہت
تجھ بن میرے دل کا آنگن سونا سونا لگتا ہے

صادقہ نواب سحر

جانے کس موج تمنا نے پکارا ہے مجھے
جانے کس گہرے سمندر میں اترنا ہوگا

بساط دل پہ مرے حادثوں کی بارش ہے
غموں کا ابر یہاں مدتوں سے چھایا ہے

گلنار آفرین

سوچا نہیں گیا، مجھے سمجھا نہیں گیا
تاریخ میں بھی مجھے لکھا نہیں گیا

میں اپنے حق کے واسطے تنہا کھڑی رہی
میزان عدل پر مجھے تولا نہیں گیا

تسنیم عابدی

ازل سے تا بہ ابد سب کے سب اکیلے ہیں
تو پھر یہ کس کے لیے زندگی کے میلے ہیں

یہ کس تلاش میں پاگل ہوا بھٹکتی ہے
عذاب کس کو گنوانے کے اس نے جھیلے ہیں

پروین شیر

کوئی صدا مرے صحراؤں میں سنائی دے
خوشی نہیں نہ سہی، زخمی کی دہائی دے

جب سے اس دیوار میں روزن ہوئے
جھانکنے والوں کے گھر روشن ہوئے

حمیرا رحمانی

تیرا دامن ہاتھ نہ آیا اپنے تو
آنسو بن کر بہنے میں بھی ڈر لگتا ہے

شبنم اس نے اتنے دکھ پہنچائے ہیں
دوست اسے اب کہنے میں بھی ڈر لگتا ہے

اندرا شبنم اندو

ڈاکٹر جاں نثار معین

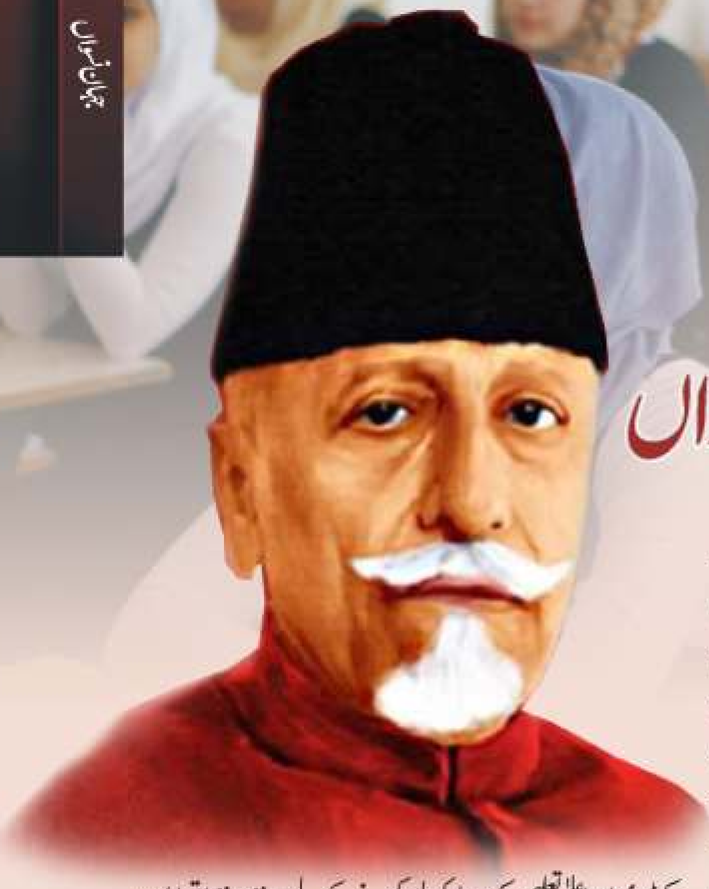

ابوالکلام آزاد اور تعلیم نسواں

ابوالکلام آزاد نے مرد اور خواتین دونوں میں تعلیم کی پختہ بنیاد ڈالی۔ آپ نے سر سید احمد خاں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عوام کی ذہن سازی کی اور ترقی کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے لیے تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ایسا جہاد شروع کیا جس کا مقصد نسلوں کی تعمیر تھا۔ چونکہ اس وقت مرد اور خواتین دونوں کے لیے تعلیم ضروری تھی۔ لیکن دونوں کو اس سے دور رکھا گیا تھا۔ آپ بحیثیت وزیر تعلیم ملکی و ریاستی سطح پر تعلیمی سرگرمیوں کو مربوط کرنے کے لیے نئے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لائے جس کی وجہ سے پورے ہندوستان میں تعلیم عام ہوئی۔ آپ نے تعلیم و تحقیق کے جو مراکز قائم کیے ان میں سنگیت اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی اور للت اکیڈمی قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے تعلیم صنعت و حرفت کو بھی ضروری قرار دیا۔ ان ہی کی کاوشوں سے 1948 میں یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا۔ 1956 میں آپ نے UGC کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا۔

ابوالکلام آزاد نے دیگر علوم فنون کے ساتھ فنی تعلیم پر بھی زور دیا۔ اس کے لیے آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جس کے ذریعے اور ملک بھر میں تکنیکی تعلیم کے نئے شعبہ قائم ہوئے ہیں۔ انھوں نے تعلیمی شعبوں میں مرد اور خواتین دونوں کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خواتین کی تعلیم سے ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہوجائیں گے۔ انھوں نے تعلیم سے متعلق پانچ پروگرام پیش کیے۔ اسکول جانے والے بچوں کے لیے بس، ناخواندہ بالغوں کے لیے سماجی تعلیم، سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے نئے نئے اقدامات کیے اور تعلیم کے لیے دیگر سہولیت کے لیے فنونی اور سائنسی تعلیم کا بہترین انتظام کیا اور فنون لطیفہ کے فروغ میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔

1951 میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کا قیام ہوا۔ بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور کے نام سے مشہور ہوا۔ دیگر شہروں میں بھی کالجوں کی شاخیں قائم کی گئیں۔ آپ ہی نے تعلیم بالغاں کی اہمیت کو اجاگر کیا جس میں پڑھنے والے مرد اور خواتین دونوں تھے۔ شہروں میں ایجوکیشنل لائبریریاں بھی قائم کیں۔ 18 فروری 1947 کی پریس کانفرنس میں آپ نے تعلیم سے متعلق بنیادی نظریہ پیش کیا کہ صحیح طور پر آزادانہ اور انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم ہی لوگوں میں زبردست تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے، انھیں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں دینی مدارس، مکاتب اور دارالعلوم کے سربراہوں کی کانفرنس ہوتی تھیں، جس میں آپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدید معلومات کو نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا۔

ابوالکلام آزاد چاہتے تھے کہ مشرقی ومغربی علوم میں ہم آہنگی پیدا ہو، یہ ترقی پذیر ہندوستان کے لیے ان کا ایک پرخلوص جذبہ تھا۔ اسی لیے آپ نے یہ بھی کہا کہ 'تعلیم کا واحد مقصد روزی اور روٹی کمانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ تعلیم سے شخصیت سازی کا کام بھی لیا جائے، یہی تعلیم کا سب سے مفید پہلو ہے۔ اسی سے معاشی وتمدنی نظام بھی بہتر ہوسکے گا۔' آپ کے تعلیمی نظریات کی بنیاد ذہنی بیداری، اتحاد وترقی، مذہبی رواداری اور

عالمی اخوت پر استوار ہے۔ آپ کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

'سوال یہ ہے کہ اب تک تعلیم پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا، اس پر غیرملکی حکومت کا قبضہ تھا، جو کچھ انھوں نے پڑھایا، ممکن ہے صحیح ہو۔ جس طرح پڑھایا اس نے ہمارے ذہنوں کو بجائے کھولنے کے بند کردیا۔'

اسی لیے وہ نصاب ودرس کے تعلق سے جدید کے اور طریقہ تعلیم کے لحاظ سے قدیم کے قائل تھے۔ آپ کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی وتوازن پر تھی۔ نئی نسل سائنس کا صحیح استعمال کرسکے، اس کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول بھی ممکن ہو جو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبردار ہونے کے باوجود سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی کی تعلیم کو ملک کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا۔ ویسے تو انھوں نے جتنے بھی تعلیمی نظریات پیش کیے ہیں تمام مرد وزن کے لیے مساوی ہیں۔ آپ طبقہ نسواں کے لیے بہت زیادہ فکرمند تھے۔ اسی لیے انھوں نے باقاعدہ تعلیم نسواں کے عنوان پر ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ منتھلی جلد: 1، نمبر 11، 1903 میں شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے:

'قوم کا سنورنا، بگڑنا تعلیمِ نسواں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس توجہ کو عملاً وجود میں لانے کے لیے آج تک جو کوشش کی گئی ہے۔ وہ کوشش صرف فضول ہی نہیں بلکہ ایک حد تک قوم کے لیے مضر بھی ہے۔'

آگے کہتے ہیں:

'پرائیویٹ مکاتب جاری کیے جائیں یا ہر خاندان کے لیے علاحدہ مکاتب بنادیے جائیں۔ ایک مدرسہ قائم کرکے اُستانیوں کو تعلیم دی جائے جو اوسط درجے کی تنخواہ پر گھروں میں جاکر پڑھائیں۔'

گھروں میں جاکر پڑھانے سے مراد ان کی یہ تھی کہ اس وقت پردہ کا ماحول سخت تھا اور مسلم خواتین عصری تعلیم سے جڑی ہوئی نہیں تھیں اسی لیے انھیں بنیادی تعلیم سے واقف کراکر بعد میں اسکول، کالجوں اور جامعیات میں بھیج سکیں۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان پر بھی سرسید، اکبرالہٰ آبادی اور علامہ اقبال کی طرح خواتین کو تعلیم گھروں میں دی جائے یہ ایک کمزور پہلو ہوسکتا ہے کیوں کہ جب وہ رانچی میں قید تھے اس وقت رانچی میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کروایا اور لڑکیوں کے لیے جدید تعلیمی نصاب لکھا لیکن سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا الگ انتظام اس لیے نہیں کروایا تھا کہ اگلی نسلوں میں یہ فاصلے ختم ہوجائیں گے۔ دونوں مل کر ہی کام کریں گے۔ ان کی یہ دور اندیش سوچ آج سچ ثابت ہورہی ہے۔

ابوالکلام آزاد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا اسی لیے وہ لڑکیوں کی سرکاری ہو یا خانگی تعلیم نہایت ہی ضروری سمجھتے تھے۔

'ہم ان تمام راہوں کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتے اور ہندوستان کے بکیس فرقہ نسواں کی بدبختی پر روتے ہیں کہ اُن کی تعلیم کی طرف اگر قوم کی توجہ بھی ہوتی ہے تو اس کا عملی نتیجہ ہونے نہ ہونے کے برابر نظر آتا ہے۔' اسی لیے وہ خطیبانہ انداز میں کہتے ہیں:

''اگر ہمیں تعلیم نسواں کی واقعی ضرورت ہے' اگر یہ سچ ہے کہ تعلیم

یافتہ نسل بلا تعلیم یافتہ ماؤں کے نہیں پیدا ہوسکتی' اگر یہ ٹھیک ہے کہ مردوں کا نیک ہونا عورتوں کے نیک ہونے پر موقوف ہے تو پہلے اس کی کوشش کرو کہ یہ پردہ جو ہماری ترقی کا بڑا مانع ہے، یہ عورتوں کی غلامی جس نے ہماری عورتوں کو کسی علمی ترقی کے لائق نہیں رکھا ہے جس سے ان کے دماغ، ان کے قوئی بالکل خراب ہوگئے ہیں، اُٹھادیا جائے اور وہ پردہ قائم کیا جائے جس کا اصلی جوہر حسنِ اخلاق ہے، جو عورت کی عصمت کی ایسی حفاظت کرتا ہے جسے مضبوط سے مضبوط ہاتھ اور بڑے سے بڑا وسوسہ متزلزل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تعلیم کے زیور سے عورتوں کو آراستہ کرو اور نہیں کر سکتا۔ ان میں اس کی استعداد پیدا کرو کہ وہ اپنی اولاد کی خود عمدہ تربیت کر سکیں۔"

اس اقتباس میں وہی خیالات جھلکتے ہیں جو سر سید اور شبلی کے تھے۔ اس وقت غیر مسلم خواتین جدید تعلیم سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ وہ قومی، سماجی اور تعلیمی ہر تحریک میں مردوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لے رہی تھیں۔ مغربی، جنوبی ہند میں گجرات اور بنگال کی خواتین کو سیاسی میدان میں آگہی حاصل ہو چکی تھی۔ 1921 کو سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا جن میں متعدد خواتین نے حصہ لیا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کی زیادتیوں کو بھی برداشت کرتی رہیں۔ خفیہ انجمنوں کی ممبر بن گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بنیں، عوام میں پر جوش آواز میں تقاریر کیں۔ اس کا اعتراف مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

"بمبئی میں تعلیم نسواں کے عجیب حیرت انگیز نمونے دیکھے۔ جنس لطیف کے پبلک لیکچر اور اسپیچیں سنیں اور پرائیویٹ صحبتوں میں ان کی قابلیت دیکھی لیکن چنداں خوشی نہیں ہوئی۔ چونکہ ان سرگرمیوں میں مسلم خواتین کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بمبئی میں اس وقت ہندو خواتین کی کانفرنس سے متاثر ہو کر عبدالقادر سرفراز کو لکھا ہے:

"زنانہ جلسہ بہت کامیابی کے ساتھ ہوا۔ گجراتی اور مرہٹی خوب بولیں بعض خواتین تو مرد معلوم ہوتی تھیں۔" شبلی کا دردمند دل یہ سب دیکھ کر تڑپتا رہا تھا۔ کاش مسلمانوں میں ایسی روشن خیال تعلیم سے آراستہ، سیاسی اور ملی شعور کی حامل خواتین ہوتیں جو قومی اور سماجی کاموں میں آگے بڑھتیں، عرب خواتین کی طرح رجز پڑھتی ہوئی تحریکوں میں حصہ لیتیں۔ امور خانہ داری کے علاوہ زندگی کی لطیف قدروں سے بھی آشنا ہوتیں! سچ تو یہ ہے کہ حرماں نصیبی کا یہ رونا اور حسرت کا شکوہ کچھ شبلی کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس دور کے اکثر جدید خیال کے مسلمان دانشوروں کا شکوہ تھا۔ وہ سب محرومیت کے احساس سے متاثر تھے۔ مگر معاشرے کی پابندیوں سے مجبور! تاریخ کا کوئی باب یا شعر وسخن کی نازک خیالی دلوں کو گدگداتی تو جی چاہتا کہ اپنے ماحول کی جنس لطیف بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتی۔ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، زیب النساء گلبدن بیگم جیسی نامور خواتین کے کارناموں کا ذکر ہو رہا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب کسی دوسری قوم یا ملک کی ہیروئن تھیں۔ بہر حال ابوالکلام آزاد کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ مسلم خواتین بغیر تعلیم حاصل کیے ترقی نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے انھوں نے تعلیمی نصاب اور سہولیات ایسی فراہم کردی کہ آئندہ نسلیں اس سے فیضیاب ہوتی رہیں۔ الحمد واللہ آپ کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج جدید علوم وفنون میں مسلم خواتین بھی مردوں کے مساوی علم و ہنر سے واقف ہو رہی ہیں۔

□□□

Dr. Jan Nisar Moin
Department of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli-500032-Hyderabad (Telangana)

ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی صورتحال

معصوم زہرا

روشن خیالی اور جدید طرز زندگی سے متاثر ہو کر ہم ہندوستانی معاشرے کو خواتین کے تئیں تفریق اور غلط برتاؤ کرنے والے قدامت پرست معاشرہ سے تعبیر کرتے ہیں جس میں مردوں کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ اس فکر کو مکمل طور پر غلط بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ آزادی کے بعد سماج کے ہر فرد کو یکساں سیاسی حقوق دیے گئے ہیں لیکن آج سماجی اور خاندانی طور پر ہندوستانی خواتین کی کیا صورتحال ہے یہ بات جگ ظاہر ہے۔ آج خواتین تعلیم یافتہ اور خودمختار تو ہو رہی ہیں لیکن جب خاندان اور سماج کی رو سے بات کی جاتی ہے تو ان کی حیثیت محض ایک شئے میں سمٹ جاتی ہے۔ عورت کو گھر کے اندر اور باہر دونوں صورتوں میں عدم تحفظ کا شدید احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ خواتین کے خلاف بڑھتے جرائم جہاں گھر کے باہر ہوتے ہیں وہیں خبروں اور رپورٹوں میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ خواتین کے خلاف ہونے والے جرائم مثلاً عصمت دری، چھیڑ خانی کے واقعات گھر کے اندر بھی پیش آتے ہیں۔ اس طرح کے بیشتر واقعات میں اکثر واقف کار، رشتہ دار یا دوست شامل ہوتے ہیں۔ تحقیقات میں بھی اکثر یہی پہلو سامنے آیا ہے اور سرکاری اعداد و شمار بھی یہی صورتحال پیش کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں تنگ ذہنیت سے پریشان ہو کر آج کی خواتین مغربی تہذیب و تمدن کو اپنے لیے نمونۂ عمل سمجھنے لگی ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب کی خواتین کو فکری آزادی، حقوق اور تحفظ حاصل ہیں۔ ہندوستانی خواتین کو ایسا لگتا ہے کہ مغرب میں خواتین کو دیے گئے حقوق اور روشن خیالی سے خواتین کا مردوں کے ذریعہ استحصال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مغرب میں خواتین کی آزادی کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ آزادیٔ نسواں کا خوبصورت خواب دکھا کر اہل مغرب بھی خواتین کا استحصال کرتا ہے۔

ہندوستانی سماج میں خواتین کی پسماندگی کی اہم وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ خواتین کو بااختیار اور تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں۔ حکومت تعلیمی میدان میں کام کر رہی ہے اور تعلیمی مہم 'بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ' جیسی مہم کے ذریعہ تعلیم پر زور دے رہی ہے۔ لیکن اس کا اثر بہت سست ہے۔ اس میں تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ آج جب یہ کہا جا رہا ہے کہ لوگوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں بیداری پیدا ہو رہی ہے لیکن سماج میں آج بھی بچیوں کی کم عمر میں شادی، جہیز، جنین کشی میں بچیوں کا قتل، بیوہ کی شادی کے مسائل موجود ہیں۔ حکومتیں اس کے لیے سخت قانون بناتی ہیں اور اس کو عمل میں لاتی ہیں۔ خواتین کی بہتری کے لیے قانون تو بنائے جاتے ہیں لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے میں اس قدر پیچیدگیاں اور دشواریاں ہوتی ہیں جس کا فائدہ اٹھا کر قصوروار بچ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خواتین کے خلاف جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خواتین کے تحفظ کے لیے بنے قوانین کو سختی سے نافذ کیا جانا چاہیے اور ان کے کام کی جگہوں، دفتروں میں خواتین کی حفاظت کے لیے مناسب انتظامات ہونے چاہیے۔ ساتھ ہی خواتین کی مناسب تعلیم اور صحت کے انتظامات پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ اگرچہ حکومت کی جانب سے اس سمت میں مثبت اقدامات کیے جا رہے ہیں لیکن خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔

پنچایت انتخابات میں خواتین کو 50 فیصد ریزرویشن دینے

جیسے اہم اقدامات کیے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور ریاستی اسمبلیوں میں 33 فیصد ریزرویشن کی بات لمبے عرصے سے کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کو ابھی تک منظوری نہیں مل سکی ہے؟۔

خواتین کو بااختیار اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے خواتین کے کام کی جگہوں دفتروں اور کمپنیوں میں حکومت کی طرف سے سخت ہدایات دی گئیں ہیں اور عورتوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے سخت قوانین بھی بنائے گئے ہیں۔ جہیز کی لعنت اور کم عمری کی شادی کے خلاف حکومت نے کمر کس لی ہے۔ خواتین کی مفت تعلیم اور بہتر علاج کے لیے حکومت نے مثبت قدم اٹھائے ہیں۔ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور نازیبا حرکت کے خلاف سخت قوانین تو بنائے جا رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس فکر کو بھی تبدیل کرنا ہوگا، جس میں عورت کو تضحیک اور پست نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

خواتین میں تعلیم کی کمی کے لیے ذمہ دار، تعلیم میں ان کی عدم دلچسپی کو بتایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ترقی کی راہ میں بہت پس ماندہ نظر آتی ہیں۔ تعلیم جو زندگی میں ترقی کی راہ کھولتی ہے اس کے لیے خواتین میں یہ رجحان پہلے بہت کم تھا۔ اب آہستہ آہستہ بیداری آ رہی ہے اور حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ خواتین کو یہ بات اب سمجھ میں آ گئی ہے کہ بغیر تعلیم کے وہ ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتی ہیں۔ اس لیے آج وہ بھی بہتر تعلیم کے لیے کوشاں ہیں۔ خواتین کی بیداواری کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں خواتین کا فیصد آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔

ہندوستان میں خواتین کی تعلیمی صورتحال میں پہلے کے مقابلے بہتری آئی ہے اور آج کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نہ ہوں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین کی ترقی کا گراف بلند ہوا ہے۔ لیکن خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے جو قوانین وضع ہوتے ہیں ان سے انھیں خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ جو قانون خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے ہیں ان میں ترمیم کے بجائے اس کو یقینی طور پر عمل میں لایا جائے تو ان کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ جنین کشی کے معاملے بھی آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ گاؤں اور پسماندہ علاقوں کے ساتھ شہروں میں اس طرح کے واقعات آج بھی پیش آ رہے ہیں۔ اگر چہ گاؤں میں اس کا تناسب فرسودہ خیالات کی وجہ سے زیادہ ہے۔ جرائم کے خلاف جو قانون بنائے گئے ہیں اس کو مضبوط اور سختی سے عمل میں لانے کی ضرورت ہے تا کہ قصورواروں کو سخت سے سخت سزا مل سکے جو دوسرے لوگوں کے لیے باعث درس و عبرت ہو۔

موجودہ وقت میں مسلم خواتین کی تعلیم کے تئیں بیداری آئی ہے۔ والدین خود اب اپنی بچیوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلانے پر توجہ دے رہے ہیں۔ اقتصادی طور پر کمزور ہونے کے باوجود مسلم والدین اپنی بیٹیوں کو 12 ویں سے آگے کی تعلیم دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، کمپیوٹر کورسز اور دیگر اسی طرح کے کورسیز جو تعلیم کی سمت میں ترقی کے نئے راستے کھولتے ہیں، کی جانب بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلم خواتین ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہو رہی ہیں۔ وقت کے ساتھ مسلم سماج کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم پر بھی مکمل توجہ دی جا رہی ہے۔ آج ہندوستان میں ایسے کئی شعبے ہیں جہاں مسلم خواتین نے اپنی قابلیت کی بنیاد پر اپنی شناخت بنائی ہے۔

آج ہندوستانی خواتین زمین سے آسمان تک اپنی کامیابی کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہی ہیں۔ خواتین اپنی کامیابی کو ثابت کرنے میں کہیں بھی پیچھے نظر نہیں آ رہی ہیں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ دیہی علاقوں میں خواتین کی تعلیم کے لیے بہتری اور اصلاح کی ضرورت ہے، کیونکہ انھیں اتنا کھلا ماحول نہیں مل پاتا ہے، جس سے شعوری طور پر ان کی ترقی ہو۔ اس کی وجہ سے وہ کہیں نہ کہیں استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔

اخباروں پر سرسری نظر ڈالنے پر بچیوں اور خواتین کے اغوا ہونے، عصمت دری اور قتل کی کم از کم ایک درجن خبریں مل جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے واقعات آئے دن خواتین کے خلاف پیش آتے ہیں جو سامنے نہیں آتے، کیونکہ بدنامی کے خوف سے دبا دیے جاتے ہیں۔ جہیز اور گھریلو تشدد کے باعث تنگ آ کر بچوں سمیت خواتین کے خودکشی کے واقعات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت سی شادی شدہ لڑکیاں سسرال میں آئے دن ہونے والی بدسلوکی سے پریشان ہو کر بچوں سمیت اپنے مائکے میں بیٹھی

ہیں۔ کیونکہ انھیں اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ بدسلوکی اور خانگی تشدد کی شکار ایسی تمام لڑکیوں کی شادیاں حسب حیثیت جہیز اور پورے رسم و رواج کے مطابق ہی ہوتی ہیں لیکن چند سالوں میں ان کی شادیاں ٹوٹنے کی راہ پر پہنچ جاتی ہیں ۔

کام کی جگہوں اور دفتروں میں خواتین کو اکثر گندی ذہنیت والے افراد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور تناؤ کی حالت میں کام کرنا پڑتا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خواتین اور لڑکیوں کے لیے حالات خراب ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جنسی ہراسانی کی سنگین شکایات سامنے آتی رہتی ہیں۔ کالج آنے جانے والی طالبات سے بدسلوکی اور چھیڑ خانی کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ کالج کے طالب علم ہی ہوتے ہیں۔

گھریلو کام کاج، جانوروں کی دیکھ بھال اور کاشت کاری کے کام کا زیادہ بوجھ حالیہ برسوں میں خواتین پر ہی ڈال دیا گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی شراب خوری کا خمیازہ زیادہ تر خواتین کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ نیشنل فیملی اینڈ ہیلتھ سروے کے مطابق ہریانہ میں 82 فیصد خواتین خون کی کمی (انیمیا) کی شکار ہیں۔ ہریانہ اور پنجاب میں 6-0 سال کی عمر کے زمرے میں 1000 لڑکوں پر بالترتیب 820 اور 793 لڑکیاں ہیں، پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ یہ دونوں ملک کے ترقی یافتہ صوبے مانے جاتے ہیں۔ خواتین کے استحصال کے جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل یہ نہ تو صرف ایک خبر ہے اور نہ ہی ان کو صرف ایک واقعہ کی طرح دیکھا جانا چاہیے۔ اگر انھیں محض خبر یا واقعہ سمجھا جاتا رہا تو صورت حال یہ ہو جائے گی کہ آہستہ آہستہ لوگ بھی صرف اور صرف قارئین اور ناظرین ہی بن کر رہ جائیں گے؟

معروف امریکی آرٹسٹ باب ڈیلان نے اپنی مشہور تصنیف میں دو تلخ سوالات اٹھائے اور جواب بھی خود ہی دیے ہیں۔ سوال کچھ اس طرح تھے کہ انسان کی چیخیں سنائی دینے کے لیے آدمی کو کتنے کان کی ضرورت ہے؟ کتنے لوگوں کو قتل کرنے کے بعد یہ مانا جانا چاہیے کہ بہت سے لوگ مارے جا چکے ہیں؟

باب ڈیلان کا یہ بیان سماج کے جذبات کی سطح سے متعلق ہے۔ یعنی صرف اور صرف آدھی عوام کو نفرت کرنے والا مانتے ہوئے اور ترقی کے نقطۂ نظر سے حاشیے کی طرف دھکیل دئے گئے۔ جس سماج کا حال ایسا بھٹکا ہوا ہو اس سماج کے مستقبل کو لے کر پرامید نہیں ہوا جا سکتا۔ گاندھی جی کے مطابق ''جس سماج میں بیٹی کے پیدا ہونے پر بیٹے جیسی خوشی نہیں ہوتی ہے، وہ سماج نیم مفلوج ہے اور فالج زدہ سماج بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کا علاج لازمی ہے۔

خواتین کی سماجی حیثیت میں تیزی سے آرہی کمی ایک بہت تشویشناک موضوع ہے۔ ایسے سنگین سوالات کو نظر انداز کر کے کچھ فضول معاملات اٹھائے جا رہے ہیں۔ شادی کے قوانین میں ترمیم کو اس طرح ایشو بنا رہے ہیں جیسے دیگر مسائل حل ہو چکے ہیں۔ اس طرح کے تنازعات سے صرف ذات پسندی اور مردوں کی بالادستی والی طاقتوں کو تقویت ملے گی۔

لہٰذا صبر و تحمل کے ساتھ ان سوالات کی فکر کی جانی چاہیے جو ملک کو تاریکی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ خواتین کی اس صورتحال کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ اس سوال میں الجھ کر الزام تراشی سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ لہٰذا پورے معاشی و سماجی نظریات کو سنجیدگی سے سمجھنے اور ترقی کے موجودہ راستے پر قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ خواتین یعنی نصف عوام کے ساتھ تفریق اور استحصال کو ختم کیے بغیر ترقی کے سبھی دعوے صحیح نہیں مانے جائیں گے۔ اس لیے خواتین کو با اختیار بنانے کے اعلانات کے بجائے وسیع پیمانے پر عملی اقدام کیے جانے چاہئیں۔ خواتین کی بہتری کے لیے مثبت رویہ اختیار کیا جانا چاہیے تبھی ہمارے ملک کی خواتین خود کفیل اور ذہنی سطح پر مضبوط اور فعال بن سکتی ہیں۔

□□□

Masoom Zahra
Centre for Social Medicine and
Community Health
JNU, New Delhi-110007

محمد سرورلون

اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات

اردو زبان و ادب کی خدمت میں خواتین کی خدمات سے چشم پوشی زیادتی ہوگی جوان کی سیاسی اور سماجی بصیرت، علمی شفقت اور شعور کی پختگی کا بین ثبوت ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے عورت کے جذبات، احساسات اور جذبۂ ایثار کو ہمیشہ فن کاری سے پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی نہیں بلکہ عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی کارفرماں رہا ہے۔

افسانے کے ابتدائی نقوش سے ہی خواتین ادیبائیں اردو ادب کے افق پر نظر آتی ہیں لیکن مخصوص سماجی وثقافتی صورتِ حال کے پیش نظر ان کی تخلیقات فرضی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخری ایام میں جن خواتین ناول نگاروں نے ناول تخلیق کیے ان میں سے بیشتر کی تعداد ایسی تھی جو نظیر احمد کی شخصیت اور ان کی تحریریوں سے متاثر تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نظیر احمد نے عورتوں کی تعلیم وتربیت، خانگی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور اسی طرح عورتوں کے دوسرے مسائل کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ یہ باتیں ان ادیباؤں کو بھلی معلوم ہوئی لہٰذا انھوں نے اپنے مسائل کو کہانیوں کی شکل میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ ''اصلاح النسا''، ''مشیر نسواں''، اور ''آہ مظلوماں'' وغیرہ ایسے ہی ناول ہیں جو عنوان سے ہی موضوع کا پتہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان ادیباؤں نے بھی تعلیم نسواں، لڑکیوں کی کم سنی میں شادی کے مضر اثرات، مشرقی عورتوں کی روایتی پاس داری اور گھریلو مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔

افسانے کا ذکر کریں تو خواتین افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حجاب امتیاز علی، نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین اور وہ افسانہ نویس خواتین جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں منظر عام پر آئیں، انھوں نے بھی عورتوں کے مخصوص مسائل پر بحث کی۔ پہلی بار مکمل طور پر افسانے کے اجزائے ترکیبی رشید جہاں کے افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے 'انگارے' میں لکھا اور اس وقت لکھا جب عورت کو آج کی طرح اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں تھی گویا رشید جہاں نے عورتوں کو سماج سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے پر آمادہ کیا۔ رشید جہاں کا اثر عصمت چغتائی پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

نصف صدی پہلے جس 'انگارے' کو رشید جہاں نے روشن کیا اسے شعلہ میں تبدیل کرنے میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں نے اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان ادیباؤں کی تخلیقات کا وافر حصہ انہی مسائل سے مملو ہے۔ اس معاملے میں قرۃ العین حیدر اور خالدہ حسین کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کہ انھوں نے بین الاقوامی مسائل کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنی تحریروں میں ہیئت وتکنیک کی سطح پر نئے نئے تجربے بھی کیے۔

1980 کے بعد جو خواتین افسانہ نگار منظر عام پر آئیں اور زیادہ حساس واقع ہوئیں ان میں ترنم ریاض، غزال ضیغم، ذکیہ مشہدی، فریدہ زین، قمر جمالی، کہکشاں پروین، شائستہ فاخری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اکیسویں صدی میں دو طرح کے افسانہ نگار ہیں۔ ایک تو وہ جنھوں نے اکیسویں صدی میں لکھنا شروع کیا، دوسرے وہ افسانہ نگار جو بیسویں صدی کی آخری

دہائیوں سے ہی لکھتے آرہے ہیں اور انھوں نے اکیسویں صدی میں بھی تحریری سفر جاری رکھا ہے۔ ان میں خواتین افسانہ نگار بھی شامل ہیں۔ ان خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض، غزال ضیغم، تبسم فاطمہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اکیسویں صدی سے اپنا افسانوی سفر شروع کرنے والوں میں ثروت خان، شائستہ فاخری، تسنیم فاطمہ، نصرت شمسی، شبانہ رضوی، زیب النسا وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ابتدائی دور کی خواتین تحریروں میں اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں اور وہ اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی یا بنت فلاں لکھتی تھیں۔ لیکن جب خاتون قلم کار بے باک ہوئیں تو اس درجہ کہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی صورتوں میں ہمارے سامنے آئیں، جن کے افسانوں کو پڑھنا کبھی معیوب، کبھی اخلاق کے خلاف سمجھا گیا اور کبھی کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ پہلے صرف اچھے یا بڑے گھرانوں کی عورتیں لکھا کرتی تھیں لیکن آج تعلیم کے عام ہونے کی وجہ سے ہر طبقہ اور سماج سے خاتون قلم کار سامنے آرہی ہیں۔ یہ سماجی اعتبار سے ایک بڑی تبدیلی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی بھی پیدا ہو رہی ہے۔ ابتدا میں خواتین، اکثر خواتین ہی کے موضوعات تک محدود رہتی تھیں رفتہ رفتہ ان کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہونے لگا۔ آج کا تخلیق کار آزاد ہے وہ کسی بھی نظریے، تحریک میں قید نہیں ہے۔ اسے فکری آزادی ہے۔ دنیا کے عالمی گاؤں میں تبدیل ہو جانے کے سبب اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی برکتوں کے باعث تمام دنیا کے موضوعات کو اپنی کہانیوں میں سمیٹتا ہے۔

اس ضمن میں پہلا اور اہم نام ذکیہ مشہدی کا ہے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام "پرائے چہرے" (1984)، "تاریک راہوں کے مسافر" (1993)، "صدائے بازگشت" (2003)، "نقش ناتمام" (2008)، اور "یہ جہاں رنگ و بو" (2013) ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیبی قدریں، آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی دھول میں گم ہوتے رشتے، فرقہ واریت، فسادات، اپنوں کی بے اعتنائی اور سماجی تفریق وغیرہ ان کے خاص موضوعات ہیں۔ افسانہ "افعی" اس کی تازہ مثال ہے۔ اس افسانہ میں یوں تو انھوں نے کالج کی زندگی اور نئے طلبہ کی ریگنگ کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تہہ تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتی کردار کے حوالے سے یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ کالج کی زندگی میں ایک مسلم طالب علم کو کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے، اس کا بیان انھوں نے اشارے کنایہ میں کیا ہے۔ ذکیہ مشہدی کے ان افسانوں کے علاوہ کئی اور افسانے ہیں جن میں انھوں نے بین الاقوامی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نئی اور پرانی تہذیبوں کے تصادم پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ "اجن ماموں کا بیٹھکہ" میں جس طرح سے پرانے زمانے کے سکون اور نئی نسل کی اتھل پتھل اور جذبات کو بیان کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ اس افسانے میں گھر کے ذریعے باہر کی بات کی گئی ہے۔ پھیلے ہوئے دائرے کو مصنفہ نے بڑی ذمہ داری اور فن کاری سے سمیٹ لیا ہے۔ 'اجن ماموں' ایک زمیندار گھرانے کے فرد تھے یہی وجہ تھی کہ زمینداروں کی طرح ان کے یہاں بھی لوگوں کی بیٹھکیں ہوتی رہتی تھیں:

> "اجن ماموں کے بیٹھکے میں احباب کا جمگھٹ ہر چھٹی کا معمول تھا لیکن آج کسی نے پنڈت نہرو کی حالیہ تقریر پر گفتگو کی، نہ سیاست اور قومی آواز کے ایڈیٹوریل زیر بحث آئے۔۔۔۔۔ اجن ماموں کی بیٹھک میں کوئی قہقہہ بھی نہیں گونجا۔" (صدائے بازگشت، ص13)

اس اقتباس سے تقسیم ہند کے قبل کا خاندانی ماحول سامنے آجاتا ہے۔ زمینداری کے زمانے میں بیٹھکے کا نقشہ مختلف ہوا کرتا تھا لیکن جیسے ہی ملک کے حالات بدلے سب کچھ بدل گیا۔ افراد خاندان کے کردار، افعال، تہذیب، سیاسی اور سماجی محرکات وعوامل بھی بدل گئے۔ یہ ساری باتیں اجن ماموں کے لیے حیران کن تھیں۔

ترنم ریاض اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ترنم ریاض کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'یہ تنگ زمین' 1998، دوسرا "ابابیلیں لوٹ آئیں گی" 2000، تیسرا "یمبرزل" 2004، اور چوتھا مجموعہ "میرا رختِ سفر" 2008 میں شائع ہوا۔ ترنم ریاض کے افسانوں میں عورت کے جذبات واحساسات، ان پر ہوئے مظالم، محرومیوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ افسانہ "ناخدا" اس کی بہترین مثال ہے۔ ان کے موضوعات کا کینوس وسیع ہے۔ رنگ ونسل، حسب ونسب، طاقت، جہالت، سیاست، ملکی وعالمی مسائل، ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری زندگی، عوام کا درد اور ان کے مسائل کو وہ اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خاندانی زندگی کے مختلف Shades کو بڑی کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس کی مثال ان کے افسانے 'پورٹریٹ'، 'حور' اور 'گچھیں' میں بخوبی ملتی ہے۔ افسانہ "پورٹریٹ" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ساس بہو کے

رشتے دوسرے عزیزوں کے ذریعے اثرانداز ہوتے ہیں۔ساس کی حد سے زیادہ سختی کی وجہ سے بہو اور بیٹے کی ازدواجی زندگی اذیت ناک بن جاتی ہے لیکن بہو سب کچھ برداشت کرتی ہے، صبر و تحمل سے کام لیتی ہے اور گھر کے ماحول کو خراب ہونے نہیں دیتی۔افسانہ''حور''میں ایک کشمیری خاندان کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس خاندان میں شریفہ اور حور دو بہنیں ہیں۔دوسرا خاندان ایک لکڑی کے کاری گر کا ہے جہاں غریبی اور مفلسی سے حالات بدتر ہیں۔بڑی لڑکی کی شادی ایک غریب گھرانے کے لڑکے سے ہو جاتی ہے۔جب کہ 'حور' کی شادی ایک گونگے شخص سے ہو جاتی ہے جو اس کے والد کی دوکان پر کام کرتا ہے۔افسانہ نگار نے شادی کے ماحول کو کشمیری رسم و رواج کے حوالے سے پیش کیا ہے:

''وقفہ وقفہ کے بعد کوئی خاتون آتی اور دلہن کے سامنے رکھی ہوئی کانگڑی میں اسپند کے دانے ڈال جاتی ایسے میں کانگڑی کے ساتھ بندھی''ژالن''سے آگ کو ہلاتی اور دانے آگ سے چھوتے ہی چیخ چیخ کر فضا میں خوشبو بکھیر دیتے۔''

(مجموعہ یہ تنگ زمین،ص:61)

افسانہ''گلچیں'' بھی ایک گھریلو سطح کا افسانہ ہے۔ بظاہر یہ دو چھوٹے بچوں کی نفسیات پر مبنی ہے لیکن خاتون خانہ کے صبر و ایثار کو بڑی باریکی سے دکھایا گیا ہے۔اس کو گھر میں ہر طرح سے ستایا جاتا ہے۔نتیجتاً وہ اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ کر مائکے چلی جاتی ہے۔ بڑے بچے کی پرورش توجہ کے ساتھ کی جاتی ہے جب کہ دوسرا بچہ افرادِ خاندان کی شفقت و محبت سے محروم رہتا ہے۔اس کا خیال گھر میں کوئی نہیں رکھتا۔جس کی وجہ سے اس میں بغاوت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔ترنم ریاض نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بچوں کے تئیں ماں باپ اور دیگر افرادِ خاندان کا خراب رویہ ان کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور اس میں نفسیاتی کج روی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے دوسرے افسانوں میں بھی یہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ان کا امتیاز یہ ہے کہ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ ہو، زن و شوہر کے درمیان کی کشمکش ہو یا پھر کشمیر کا مسئلہ ہو وہ بڑی آسانی سے اسے ایک انسانی مسئلے کی شکل دے دیتی ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا ابتدائیہ اور خاتمہ چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ طارق چھتاری ان کی افسانہ نویسی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ترنم ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دل پر اثرانداز ہوتے ہیں پھر فہم و دانش سے لبریز ہو جانے والے دل سے پھوٹتی شعائیں اس کے ذہن کو بھی منور کر دیتی ہیں اور خود کو افسانے کا ایک کردار سمجھ کر افسانہ نگار کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ فن کی معراج ہے، اس کی کسوٹی پر ترنم ریاض کے افسانے پورے اترتے ہیں۔''

(شعر و حکمت' دسمبر 2006،ص356)

غزال ضیغم کا نام اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' 2000 میں شائع ہوا۔اس مجموعے کے''سوریہ ونشی چندر ونشی''،''مدھوبن میں رادھیکا''اور''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' جیسے افسانے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہے۔ وہ نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔افسانہ''مدھوبن میں رادھیکا'' موضوع کے تنوع کے ضمن میں اہم ہے۔اس افسانے میں نجمہ باجی کا کردار ماڈرن عورت کا استعارہ ہے جن کی شخصیت میں سگریٹ پینا، مردوں کے ساتھ اختلاط، شوہر کے ہوتے ہوئے تنہائی کی سی زندگی گذارنا اور اس طرح کے دوسرے خصائص شامل ہیں جب کہ ان کو مردوں سے شدید نفرت ہے اور اس بات کا اندازہ ان کی تحریروں سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔عورت، غزال ضیغم کے افسانوں کا محبوب استعارہ ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کا روپ ہر جگہ نظر آتا ہے۔افسانہ''خوشبو'' میں ایک بہن، ماں کے روپ میں ہے اور وہ اپنی والدہ کی وفات کے بعد بھائی کی ہر بات کا خیال رکھتی ہے تو افسانہ ''بے دروازے کا گھر'' میں ایک عورت خود کفیل ہے اور اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھنا چاہتی ہے وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ اسے حقیر و کمتر سمجھتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

افسانہ''زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں'' میں غزال ضیغم نے عورت کی ہمت و جرأت کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔غزال ضیغم نے اس افسانہ میں بڑی عمدگی کے ساتھ معاشرتی نظام کی تصویر کشی کی ہے۔خاندانی روایتیں، عداوتیں، رنجشیں کیسے خاندان کے خاندان تباہ کر دیتی ہیں فرح کے سامنے جب اس کے بھائی کا گولیوں سے چھلنی جسم آتا ہے تو جہاں وہ فطری طور پر ٹوٹتی ہے، غم میں ڈوب جاتی ہے، وہیں اس کے اندر ہمت و حوصلے کی ایک مضبوط لہر اٹھتی ہے۔ اپنے بھائی کے دونوں بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی وہ ایک نیا قدم اٹھاتی ہے:

''دونوں بچے سہم کر پھوپھی سے لپٹ گئے۔اس نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر بھیڑ کی طرف منہ کر کے

سرخ آنکھوں سے مخاطب ہوئی۔ ''اب میں مقدمہ لڑوں گی۔
دنیا کی اس عدالت سے اس عدالت تک۔'' اس کے چہرے
پر گہرے عزم کی چھاپ اور آواز میں چھپی تاثیر دیکھ کر خاندان
کے سارے زندہ لوگوں کی آنکھیں مردہ ہوگئیں۔''

(افسانہ'زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں' 'ایک ٹکڑا دھوپ کا، غزال ضیغم،ص:83)

غزال ضیغم کا افسانہ ''سوریہ وشی، چندرونشی'' موضوع کے لحاظ سے اہم افسانہ ہے۔ اس میں تانیثی فکر بھی موجود ہے۔ اس کا مرکزی کردار روحی خان ہے جو ایک کنورٹڈ مسلم (شیعہ) خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ اچھا خاصا زمیندار گھرانہ تھا جس میں لڑکیوں کا نام خاندانی شجرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ خاندان کی پہلی ایسی لڑکی ہے جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ وہ رعایا پر ظلم وستم دیکھ کر کانپ اٹھتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کے اس طرح کے رویے کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ دیہات کے ایک دوسرے غریب گھرانے سے اس خاندان کو جوڑا گیا ہے۔ سریتا، روحی خان کی روم میٹ ہے وہ اس کی مالی امداد بھی کرتی ہے۔ ہاسٹل سے گھر پہنچنے پر روحی شادی کا ماحول دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

''جی نہیں شادی مجھے کرنی ہے۔ فیصلہ میں خود کروں گی۔۔۔
میں ہرگز شادی نہیں کروں گی، زہر کھالوں گی۔۔۔۔ میں
آپ کی زمین کا خطہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہیے آپ دے
دیجیے۔ اکیس سال کی لڑکی ہوں قانونی حق ہے میرے پاس
بالغ ہونے کا۔''

(ایک ٹکڑا دھوپ کا،ص23)

یہ ایک آزاد اور خودمختار عورت کی آواز ہے جو پورے سماجی نظام کو بدلنے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو اپنے مقصد، موضوع، زبان اور تاثر کی بنیاد پر آج کی کامیاب کہانیوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ''مشت خاک'' ایک سیاسی افسانہ ہے لیکن اس میں خاندانی زندگی کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ دیہات کا ایک ایسا زمیندار گھرانہ جہاں زمینداری کے خاتمے کے بعد گاؤں کی فضا بدلنے لگی۔ دیہات کے ادنیٰ طبقہ کے لوگ بڑے شہروں میں جاکر بس گئے۔ مالی حالت بہتر ہوئی تو یہ لوگ بڑے بڑے خواب دیکھنے لگے اس لیے اطہر میاں کی وہ عزت وتوقیر اپنے گاؤں میں نہ رہی جو زمینداری کے وقت میں تھی۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''اس بار رام لال کا لونڈا گرمی کے موسم میں جو پلٹا تو اس کا
نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ گرم نیا خون جوش مار رہا تھا۔ الیکشن
آتے ہی جھٹ پرچہ نامزدگی داخل کردیا اور کھڑا ہوگیا اطہر
میاں کے مقابلے۔'' (ایک ٹکڑا دھوپ کا،ص106-105)

حالات کے دباؤ نے اطہر میاں کو گاؤں کے مڈل اسکول میں نوکری کرنے پر مجبور کردیا اور ایک ایسا خاندان جس کا ماضی میں رعب و دبدبہ تھا وقت کے ہاتھوں بے وقعت ہوگیا۔

ثروت خان نے 2000 کے آس پاس سے افسانے لکھنا شروع کیے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زروں کی حرارت'' 2004 میں منظر عام پر آیا۔ ترنم ریاض کے بعد وہ دوسری افسانہ نگار ہیں جنھوں نے علاقائیت کو اپنے افسانوں میں فروغ دیا۔ اردو ادب میں راجستھان اور وہاں کی تہذیب وثقافت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ ثروت خان نے ان امور پر توجہ دی اور ان کو اپنے افسانوں کا محور قرار دیا۔ ان کے یہاں براہ راست خاندانی زندگی کا بیان بہت کم ہے جو کچھ بھی ہے وہ راجستھانی کلچر کی پیش کش کے تئیں ہے۔

ثروت خان کا افسانہ ''میں مردمار بھلی'' بنیادی طور پر عورتوں کی نفسیات اور ازدواجی زندگی میں ان کے استحصال سے عبارت ہے۔ انھوں نے کیرتی اور سنبل دو کرداروں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ سنبل کو اس کا شوہر شراب کے نشے میں زدوکوب کرتا ہے، جب کیرتی اسے پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے تو سنبل بیچ میں آکر کہتی ہے:

''نہیں کیرتی نہیں! یہ میرا مجازی خدا ہے۔ تم بیچ میں نہ
آؤ۔'' (زروں کی حرارت،ص:13)

کیرتی سنبل کی بات سن کر جواب دیتی ہے:

''سنبل پتی پرمیشور ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے لیکن یہ سب
القاب ان مردوں نے ہم عورتوں پر ظلم کرنے کے لیے گڑھے
ہیں۔ خودمختاری میں خدا اور پرمیشور بن بیٹھے اور ہمیں ابلا اور
صنف نازک قرار دیا۔ یہ سب ڈھونگ ہیں۔ پکے ڈھونگی۔''

(زروں کی حرارت،ص14)

یہ افسانہ عورتوں کے گھریلو مسائل اور ازدواجی زندگی کی دشواریوں کا غماز ہے۔ یہ کہانی ہندوستانی سماج میں عورتوں کے دو متضاد رویوں کو پیش کرتی ہے لیکن دونوں ہی رویے طے شدہ ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے دیگر افسانوں میں بھی خاندانی زندگی کی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اس کے علاوہ کہکشاں پروین بھی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ کہکشاں پروین کسی رجحان سے متاثر نہیں ہیں بلکہ آزادانہ طور پر افسانے کی دنیا آباد کررہی ہیں۔ اردو ادب کے زوال پر وہ گہری سنجیدگی کا اظہار کرتی ہیں۔ ''قاعدہ'' اس پس منظر میں لکھا گیا اچھا افسانہ ہے۔

شائستہ فاخری کا نام افسانوی دنیا میں نیا نہیں ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ افسانوی منظر کے افق پر نمودار ہوئی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ہرے زخم کی پہچان'' 1990 میں منظر عام پر آیا تھا۔ بیس سال کی طویل خاموشی کے بعد دوسرا مجموعہ ''اداس لمحوں کی خودکلامی'' 2011 میں شائع ہوا۔ شائستہ فاخری کے ابتدائی افسانے خوف وہراس میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوف و ہراس سماجی مسائل کا عکاس ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سماج میں عورتوں کے مسائل اور پدری معاشرے میں ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا۔ افسانہ ''سنو! رضو باجی'' اس کی واضح مثال ہے۔ شائستہ فاخری نے عورتوں کے مسائل کے علاوہ دوسرے معاشی ومعاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان افسانوں میں ''آفندی کا بیٹا''، ''کلر بلائنڈ''، ''آزاد قیدی'' وغیرہ ایسے عمدہ افسانے ہیں جن میں کئی معنویتوں کا ایک نظام پوشیدہ ہے۔ ''اداس لمحوں کی خودکلامی'' ہم جنسیت پر لکھا ہوا اچھا افسانہ ہے۔ ''کنور فتح علی'' اور ''ریچھ'' میں بھی جنسیات کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔

تبسم فاطمہ عرصے سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا حالیہ مجموعہ ''تاروں کی آخری منزل'' 2012 میں منظر عام پر آیا جس میں کل سترہ افسانے شامل ہیں۔ ان سبھی افسانوں میں تانیثی فکر بہت نمایاں ہے۔ جس کو خاندانی زندگی کے توسط سے اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ ''حجاب'' میں ایک مسلم متوسط طبقے کے خاندانی ماحول کا بیان ہے۔ جس میں مذہب کا سخت پہرہ ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، ایک شریف اور سوگھڑ عورت کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اس گھرانے میں لڑکیوں کے اسکول میں پڑھنے کو بدعت وکفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''مسلم لڑکیاں بس پیدا ہوتے ہی ایک تنگ دربے میں بند کر دی جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک بڑا دربہ کبھی بڑے ابا کے گھر دیکھا تھا اس میں مرغیاں ٹھنسی رہتی تھیں اسی گھر میں رہتی تھیں نجمہ باجی۔ بڑے ابا کی اکیلی لڑکی۔ لیکن بے نور چہرہ جیسے سہمی ہوئی گائیں ہوتی ہیں۔ بڑے ابا ٹھہرے نمازی پرہیزگار۔ گھر میں اکثر ایک لفظ سننے میں آتا تھا۔۔۔ تبلیغی جماعت۔ تو بڑے ابا تبلیغی جماعت کے تھے گھر میں بس انھیں کی چلتی تھی۔'' (تاروں کی آخری منزل، ص 22-21)

افسانے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج کی عورت خاندانی زندگی کی جکڑ بندیاں، مردوں کی انانیت اور بے جا دباؤ کو توڑ دینا چاہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بدلتی ہوئی خاندانی صورتوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ تبسم فاطمہ کے برعکس اشرف جہاں کے یہاں عورتوں کے روایتی یا بنیادی مسائل موضوع بنتے ہیں۔ ''اکیسویں صدی کی نرملا'' کے نام سے شائع ان کے افسانوی مجموعے میں ہجرت اور طلاق جیسے حادثات کا کرب ہے اور عورت کی ازلی فطرت، محبت اور ایثار وقربانی کا جذبہ بھی۔ احتساب، بدر کامل، شکنتلا اور اکیسویں صدی کی نرملا میں عورت کی تنہائی، بے بسی اور مرد کی بے اعتنائی کا اظہار تو ہوتا ہی ہے اپنی بقا، تشخص اور آزادی کے لیے احتجاج کا رویہ بھی ملتا ہے۔

آج خواتین افسانہ نگار حقیقت کا اظہار اپنے افسانوں میں کر رہی ہیں۔ ان کے یہاں اگر ایک طرف گھریلو ماحول کو کثیف بنانے والے رشتوں کی گھٹن کا احساس ہے تو دوسری طرف سیاسی وسماجی بے اطمینانی اور قدروں کی شکست وریخت کا اظہار بھی۔ جنسی موضوعات پر قلم اٹھانے سے پہلے انھیں یہ خیال نہیں ستاتا کہ ان کی کہانی ضبط ہو جائے گی۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں یورپ کی تانیثی تحریک کی طرح مردوں کے خلاف جارحانہ انداز تو نظر نہیں آتا لیکن وہ اپنی باتوں کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں لے کر چلتی ہیں کہ عورتوں پر حالات کا جبر، مردوں کی زیادتیاں، جہل کے اثرات سب بے نقاب ہو جائیں اور یہ بھی کہ مرد کی مکاری وخود غرضی بہوؤں پر ساس کے ظلم وغیرہ سب صورتیں واضح ہو جائیں۔ نئے افسانوں میں خاندانی زندگی کے توسط سے جنسی میلانات، نفسیاتی پیچیدگیاں اور ذہنی الجھنوں کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ ایک لمبی فہرست ہے جن میں کہکشاں انجم، شمیم نکہت، قمر جہاں، ذکیہ ظفر، بانو سرتاج، حاجرہ شکور، افشاں ملک، وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے موجودہ دور کے تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ وہ موضوعاتی اور فنی وتکنیکی سطح پر افسانہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مصروف نظر آرہی ہیں۔

□□□

Mohd. Sarwar Lone
Ph.D Scholar ,Dept. of Urdu
University of Hyderabad
Gachhi Bowli,
Hyderabad-500046 (Telangana)

امان اللہ

خواتین کی پسماندگی

اسباب اور تدارک

آج پوری دنیا میں خواتین دوہرے استحصال کا شکار ہیں خواہ وہ اجرت کا معاملہ ہو یا سماجی رویوں کا، مساوات کا معاملہ ہو یا سماجی نظریات کا، ہر شعبہ میں خواتین پدرشاہی نظام یا مردانہ ظلم و جبر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے درپیش مسائل ان کے خلاف جرائم، ظلم و تشدد اور استحصال کے متعلق ہندوستان کی صورتِ حال بہت نازک ہے۔ کہیں ہندوستان کی غیر ضروری رسموں اور رواجوں کی آڑ میں تو کہیں سماج میں رائج ثقافتی روایت کے جبر سے خواتین دوچار نظر آتی ہیں۔ آج خواتین کو object کے طور پر دیکھا جاتا ہے انھیں ان کی آزادی سے محروم کر کے ان کو معاشرے میں کوئی فعال کردار نہیں دیا جاتا یہاں تک کہ سماجی عمل میں شرکت اور مداخلت کی ممانعت ہوتی ہے۔ "البتہ متوسط طبقے میں مرد و عورت کے کاموں کو واضح طور پر الگ رکھا گیا ہے۔ وہ کام جو خانہ داری سے متعلق ہیں ان میں اور وہ کام جو روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر کیے جاتے ہیں بہت واضح امتیاز برتا جاتا ہے"۔ (1) جبکہ خواتین کا کردار معاشرے کی تعمیر و تربیت اور ترقی میں اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستانی معاشرے نے خواتین کو وہ سازگار ماحول نہیں دیا جس سے خواتین گھریلو مسائل اور ظلم و تشدد کے خلاف گھر سے باہر کی طرف قدم بڑھانے کی جرأت کر سکیں۔ حالانکہ خواتین صرف اپنے حق کی خواہاں ہیں اور ایک بہتر زندگی چاہتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے وقار کو مجروح کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرد عورت کی عزت اور حفاظت کا ذمہ دار ہے، خالق کائنات نے بھی مرد کو قوام بنا کر بھیجا ہے۔ آخر ہمارا سماج یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ، اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں۔ ہمیں یہ بات سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کہ عورت ہی ہے جو زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔ وہ کبھی ماں تو کبھی بیٹی کبھی بیوی تو کبھی بہو کی شکل میں زندگی کا مقصد بتاتی ہے۔ خواتین الگ الگ شعبوں میں کام کرتی ہیں اور گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ دستکاری اور زراعت میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے لیکن خواتین کے اس کردار کے باوجود معاشرتی روایات کی خاطر ان کو وہ سماجی حیثیت اور وقار نہیں دیا جاتا جس کی وہ حق دار ہیں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں وہاں وہ شدید استحصال کا شکار ہوتی ہیں استحصال کی صورت الگ الگ ہو سکتی ہے۔ جہاں ان سے حد سے زائد کام تو لیا جاتا ہے لیکن اُجرت مردوں کی بہ نسبت کم دی جاتی ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اُس اُجرت پر بھی اکثر مردوں کا ہی اختیار ہوتا ہے۔ معاشرے میں اور بالخصوص کام کی جگہ پر انھیں مختلف قسم کے مسائل درپیش آتے ہیں جس میں ان کے ساتھ جنسی ہراسانی عام بات ہے۔ ہمارے سماج میں خواتین کے خلاف مختلف قسم کے جرائم ہوتے ہیں۔ نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو رپورٹ میں ان جرائم کی درجہ بندی دو حصوں (SLL&IPC) میں کی گئی ہے۔ IPC سے مراد Indian Penal Code اور SLL سے مراد Special and Local Laws ہے۔ اِن جرائم کی وجہ سے خواتین بہت متاثر ہوتی ہیں۔ آج اِس جدید دور میں خواتین کی بڑی تعداد ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور معاشی استحصال کا شکار نظر آتی ہیں جو ان کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ہے اس کے باوجود خواتین کے خلاف جرائم مسلسل ہو رہے ہیں جس کا ثبوت نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو رپورٹ میں دیے گئے یہ اعداد و شمار ہیں:

Crime against women(IPC&SLL)-2014- 2016(2)
(IPC-Indian Penal Code)(SLL-Special Local Laws)

State/UT	2014	2015	2016
Madhya Pradesh	28756	24231	26604
Maharashtra	26818	31216	31388
Rajasthan	31216	28224	27422
Uttar Pradesh	38918	35908	49262
West Bengal	38424	33318	32513
Delhi/Union Territory	15319	17222	15310
Total All India	339457	329243	338954

ان اعداد وشمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ پانچ ریاستیں اور دہلی وقومی دارالحکومت علاقہ خواتین کے خلاف جرائم کے لحاظ سے دوسری ریاستوں کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔

خواتین کے خلاف جرائم میں جنسی زیادتیاں، گھریلو تشدد، تیزابی حملے، اغوا کرنا، خودکشی، عزت کے نام پر قتل، اموات جہیز، عصمت ریزی، لڑکیوں کی تجارت، استحصال، نازیبا پیش کشی، لڑکیوں سے چھیڑ خانی، اسقاط حمل، ستی، بیوگی کا نظام وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں سے چند جرم کے اعداد وشمار یہاں پیش کیے جارہے ہیں:

IPC & SLL Crime Against Women-2016 (3)

S.N	Crimes	Total All India Incidece
1	Dowry Deaths	7621
2	Cruelty by Husband or his relatives	110378
3	Kidnapping & Abduction of Women	64519
4	Rape	38947
5	Attempt to Commit Rape	5729
6	Assault on women with outrage her modesty	84746
7	Total IPC Crime	325652
8	Total SLL Crime	13302

NCRB2016 کی رپورٹ کے مطابق 2015 میں ہندوستان میں خواتین کے خلاف جرائم کی کل تعداد 338954 تھی۔ ان اعداد وشمار سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواتین کے تحفظ کے متعلق ہندوستان کی کیا صورت حال ہے۔ یہ جرائم خواتین کی زندگی کو متاثر کررہے ہیں۔ ان اعداد وشمار کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی خواتین مردوں کے مقابلے میں پسماندہ ہیں۔

درج ذیل جرائم کے علاوہ خواتین کو متاثر کرنے والے امور میں غیر مساوی حق، حقوق کی پامالی، صنفی امتیاز، ثانوی حیثیت، فیصلہ سازی کا حق، مرضی کے خلاف شادی، پدرشاہی نظام، سماج کی منفی سوچ ونظریات، ہوس زدہ ماحول، میڈیا اور سوشل میڈیا کا غلط استعمال، معاشی بدحالی وغیرہ ہیں۔ یہ امور خواتین کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ جہیز جیسی رسم کی وجہ سے معاشرے میں لڑکیوں کے ساتھ غلط رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے۔

"ہندوستان کی کل آبادی 1210569573 ہے جن میں مردوں کی تعداد 623121843 وعورتوں کی تعداد 587447730 ہے۔ جنسی تناسب 1000 مرد پر 943 عورتیں ہیں۔ ہندوستان کی تعلیمی شرح یا شرح خواندگی 74.04 فیصد ہے جس میں مردوں کی شرح خواندگی 82.14 فیصد اور عورتوں کی شرح خواندگی 45.46 فیصد ہے"۔(4) یہ اعداد وشمار بھی خواتین کی پس ماندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کے رسم ورواج نے ایسے رجحانات پیدا کیے ہیں جس کی وجہ سے انسانوں کی فطرت میں منفی نظریات کو پختگی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق مشکل سے حاصل ہوتا ہے' جبکہ جمہوریہ ہند کا دستور اپنے مقاصد میں مساوات کے اصول کو بھی شامل کرتا ہے۔ ہندوستان کے دستور نے زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں اور عورتوں کے لیے مساوات کا اعلان کیا ہے، دستور کی دفعہ 15 میں کہا گیا ہے کہ مملکت کسی بھی شہری کے خلاف مذہب، ذات، صنف، جائے پیدائش یا ان میں سے کسی ایک کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں رکھے گی، دفعہ 16 میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مملکت کے زیر انتظام کسی بھی عہدہ پر تقرر یا روزگار سے متعلق معاملات میں تمام شہریوں سے مساوات برتا جائے گا، دفعات 325 اور 326 کے تحت عورتوں کو نہ صرف رائے دہی کا حق دیا گیا بلکہ انتخابات میں مقابلہ کرنے کا حق بھی دیا گیا، وہ

ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لے سکتی ہیں اور اعلیٰ ترین سے لے کر ادنیٰ ترین عہدے پر فائز ہوسکتی ہیں۔'(5) باجوداس کے صورت حال کیا ہے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

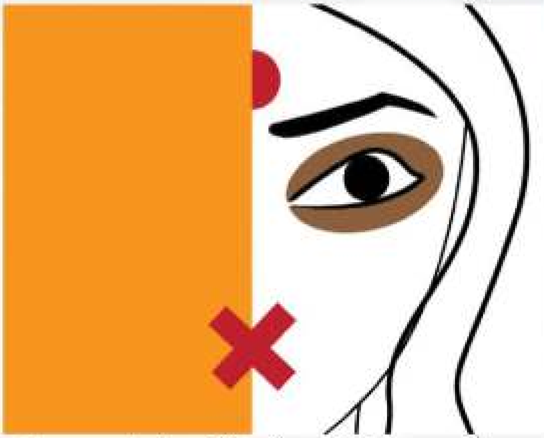

اگر ہم عورت کے کردار پر نظر ثانی کریں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت مظلومیت کا شکار ہے۔ پسماندگی کا مطلب محض غریبی یا کمزوری نہیں ہوتا دراصل یہ ایک ایسا عمل ہے جو لوگوں کو مرکزی سماجی دھارے سے الگ کرنے کے بعد انھیں ریاست یا غیر ریاستی ڈھانچے سے باہر نکال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ بے اختیار ہوجاتے ہیں اور اس کی بہترین مثال پسماندہ خواتین ہیں۔ غور طلب بات تو یہ ہے کہ ماہرین علم بھی اس بات سے متفق ہیں کہ پسماندگی سماجی تمدنی اور سیاسی معاشی ساخت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عام طور پر غریب طبقے ہی پسماندہ ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ غربت لازمی طور پر پسماندگی کا سبب نہیں ہوتی۔ کچھ مخصوص پالیسیاں اور تاریخی رجحانات آمدنی کے اعتبار سے غربت، محرومی اور مفلسی کا باعث بنتے ضرور ہیں لیکن ان سے پسماندگی کی پیدائش لازمی نہیں ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں پسماندہ خواتین نا صرف غریب یعنی معاشی طور پر کمزور ہیں بلکہ عدم مساوات، جہالت، ناخواندگی اور ظلم و جبر کی شکار ہیں۔ اس مسئلے کا حل ابھی تک کسی نے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین کی پسماندگی میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر خواتین اپنے حقوق سے آگاہ ہوں تو یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود پر ہورہے ظلم و جبر کے خلاف بااختیار افراد کو چیلنج کرسکتی ہیں۔ خواتین کو اپنے تئیں بیدار ہوکر اپنے مسئلوں کا حل خود ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خواتین کی پسماندگی دور کرنے کے لیے، انھیں اس مسئلہ سے باہر نکالنے کے لیے ہمیں کئی پہلوؤں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ان کی پسماندگی کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدید دور میں عورت میں اتنا شعور باقی ہے کہ وہ اپنی راہ میں حائل دشواریوں کا سامنا کر سکے۔ ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ انھیں وہ مواقع دیے جائیں جو مرد کو پہلے سے ہی حاصل ہیں ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ عورت بھی معاشرے کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ مرد۔ اس کے حقوق میں کمی اور اس کے ساتھ امتیازی سلوک، اس کا استحصال معاشرے کو تنزلی کا شکار بنا رہا ہے اس لیے ضروری ہے کہ مرد و عورت کے درمیان امتیازی سلوک کو ختم کر دیا جائے۔ پسماندہ طبقہ یعنی خواتین کو بااختیار بنانا ہوگا۔ انھیں معاشی طور پر خود کفیل بنانا ہمارا بنیادی مقصد ہونا چاہیے کیوں کہ ہمارے ملک میں خواتین کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کو جب تک سماجی طور پر مساوات حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک سیاسی معاشی اور تعلیمی طاقت کے حصول کا نعرہ بے معنی ہے۔ خواتین کے مسائل کا حل نکالنا بہت ضروری ہے۔ ممتاز سماجی سائنسدانوں نے کہا ہے کہ صنفی بااختیاری کا مطلب مرد حضرات کے خلاف لڑائی نہیں ہے بلکہ مردانہ تسلط کی ذہنیت کے خلاف جدوجہد ہے۔ خواتین کی بااختیاری انھیں پسماندگی سے باہر لانے میں مدد کرے گی۔

حوالہ جات

(1) صغرا مہدی، مترجم۔ ہندوستان میں عورت کی حیثیت۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی۔ 1980۔ ص 47

(2) Crime in India Report-2016(2015)، Government of India.Ministry of External Affairs NCRB

(3) Crime in India Report-2016(2015)، Government of India.Ministry of External Affairs NCRB

(4) Census 2011، www.censusindia.gov.in

(5) ڈاکٹر آمنہ تحسین، مطالعاتِ نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008، ص 59

❑❑❑

Amanullah
Research Scholar
Dept. of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 (Telangana)

صبا انجم

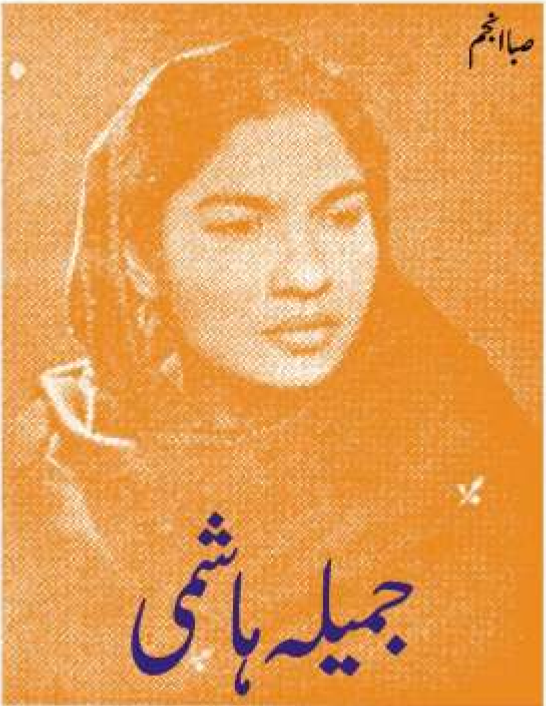

جمیلہ ہاشمی
کے تاریخی ناول

آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے باعث سیاسی وسماجی انتشار پھیلنے کے سبب لوگوں میں جو تہذیبی و مذہبی اختلافات پیدا ہوئے وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا بہت دردانگیز المیہ ہے۔ ان فسادات اور سیاسی بدنظمیوں نے بہت سے ذہنوں کو منتشر کردیا جس کا اثر عام انسانیت پر پڑا جس کے زیر اثر زیادہ تر مصنفین نے اپنے مضامین اور ناولوں کے ذریعے یا تو فرقہ پرستی کی حمایت کی یا ان حالات سے لذت اندوزی کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ہی حقیقت نگاری اور نفسیاتی تحلیل کے نام پر انسانی فضیلت اور حقیقی سچائی سے انکار کرنے لگے۔

تقسیم ہند کے تاریخی ناول نگاروں نے بھی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس سلسلے میں وقار عظیم کا بیان ہے کہ:

> ''تقسیم ہند کے بعد اردو میں جتنے ناول لکھے گئے ان میں ایک بڑی تعداد تاریخی ناولوں کی ہے۔ اردو میں تاریخی ناولوں کی ایسی یورش ہوئی کہ اردو داں طبقہ شاید یہ کچھ مدت کے لیے بھول ہی گیا کہ ناول تاریخی ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے۔'' (وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، کراچی، 1961، ص 87)

آزادی کے بعد اردو ناول نگاروں نے ان تمام مسائل کو پیش کیا ہے جو مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اس کے علاوہ تاریخی ناول نگاروں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے جس میں نسیم حجازی، عنایت اللہ التمش، مائل ملیح آبادی، ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، قاضی عبدالستار، قیس رام پوری وغیرہ ہیں اس سلسلے میں ہم جمیلہ ہاشمی کا نام بھی شمار کرسکتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کا پہلا ناول ''تلاش بہاراں'' اپنی مخصوص تکنیک کی بنا پر قدرومنزلت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کئی ناولٹ منظر عام پر آچکے ہیں جس میں 'آتش رفتہ'، 'چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'، 'روہی'، 'داغ فراق'، 'اپنا اپنا جہنم' (تین ناولٹ کا مجموعہ) ہے۔ 'آپ بیتی جگ بیتی' (افسانوی مجموعہ) 'رنگ بھوئی' دوسرا افسانوی مجموعہ دیگر ایسے متفرق افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا آخری ناول 'دشتِ سوس' ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے یوں تو طویل عمر نہ پائی تھی لیکن اس کم عرصے میں بھی انھوں نے جو لکھا ان کی تخلیقات نے انھیں شہرت دوام بخشا۔ جمیلہ ہاشمی کا کینوس بہت ہی وسیع ہے انھوں نے پنجاب کے گاؤں گھر کھیت سے لے کر چولستان کے صحرا سے ہوتے ہوئے ایران کی سرزمین اور بغداد سے گزر کر اسپین تک کی سرزمین کو اپنی تخلیقات میں سمویا، آزادی کے بعد لکھنے والے اہم فکشن نگاروں میں جمیلہ ہاشمی کا شمار بھی سرفہرست ہوتا ہے۔ یوں تو جمیلہ ہاشمی نے زیادہ طویل عمر پائی اور نہ ہی ان کی تخلیقات میں ناولٹ اور افسانے بہت زیادہ لکھے گئے بلکہ جو لکھا اس نے انھیں شہرت دوام بخشا۔

جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں تاریخی اعتبار سے لکھے گئے فکشن کا مطالعہ کریں تو صرف دو ناول ایسے ہیں جو انھوں نے تاریخی کرداروں پر لکھے ہیں جس میں ایک 'چہرہ بہ چہرہ روبہ رو' ناولٹ ہے اور دوسرا ان کا آخری ناول ''دست سوس'' اس کے علاوہ 'آتش رفتہ'، 'داغ فراق'، 'روہی'، 'اپنا اپنا جہنم' اور 'یادوں کے آلاؤ' ان کے ناولٹ ہیں جنھیں بعض ناقدین نے اپنے مطابق طویل افسانوں میں شمار کیا ہے تو بعض نے انھیں ناولٹ ہی کہا ہے اور بقیہ ان کے افسانے ہیں۔ انھوں نے بہت زیادہ تو نہیں لکھا لیکن ان کی دیگر تصانیف میں تاریخی اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو ایک ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' (ناولٹ) اور دوسرا ''دشت سوس'' (ناول) ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے بیشتر افسانوں جیسے 'ترمورتی'، 'چندن کی چتا'، 'بھسم'، 'آتما کی شانتی' اور 'بن باس' وغیرہ میں ہمیں جہاں ہندو کلچر اور قدیم دیو مالائی اثاثے ملتے ہیں وہیں ان کے ناولوں میں اسلامی تاریخ کے دو ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں اپنے نام کا لوہا منوایا اور

آج بھی کسی نہ کسی سبب یاد کیے جاتے ہیں۔

’جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں تاریخی اعتبار سے لکھے گئے فکشن کا مطالعہ کریں تو صرف دوناول ایسے ہیں جو انہوں نے تاریخی کرداروں پر لکھے ہیں جس میں ایک ’چہرہ بہ چہرہ روبہ رو‘ ناولٹ ہے اور دوسرا ان کا آخری ناول ”دشت سوس“ اس کے علاوہ ’آتش رفتہ‘، ’داغ فراق‘، ’روہی‘، ’اپنا اپنا جہنم‘ اور ’یادوں کے آلانو‘ ان کے ناولٹ ہیں جنہیں بعض ناقدین نے اپنے مطابق طویل افسانوں میں شمار کیاہے تو بعض نے انہیں ناولٹ ہی کہاہے اور بقیہ ان کے افسانے ہیں۔ انہوں نے بہت زیادہ تو نہیں لکھا لیکن ان کی دیگر تصانیف میں تاریخی اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو ایک ”چہرہ بہ چہرہ روبہ رو“ (ناولٹ) اور دوسرا ”دشت سوس“ (ناول) ہے‘

یہ دوکردار قرۃ العین طاہرہ اور حسین بن منصور حلاج ہیں۔

قرۃ العین طاہرہ، جو یک بابی فرقہ کی ابتدااوراس تحریک کے سبب جانی جاتی ہیں۔ان کا یہ ناولٹ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اسی یک بابی فرقہ کی ابتدااوراس تحریک کے اسباب وعوامل سے متعلق ہے۔ اس پس منظر میں جمیلہ ہاشمی نے اُمِ سلمہ (قرۃ العین طاہرہ) کے کردار کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیاہے۔اس ناولٹ کاعنوان قرۃ العین طاہرہ کی ایک مشہور غزل کے اس مطلع سے لیاگیاہے:

گر بتوں افتدم نظر، چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ

شروع وہم غم ترا، نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

قرۃ العین طاہرہ کی ہی غزل علامہ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں نقل کی ہے۔ یہ ناولٹ شرر کے مشہور ناول ”فردوس بریں“ کی یاد دلاتا ہے۔ ”فردوس بریں“ بھی ایک مذہبی فرقے ،فرقہ باطنیہ کے بارے میں ہے۔ اس میں شیخ علی وجودی کا کردار حسن بن صباح کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس ناولٹ میں جمیلہ ہاشمی کا موضوع بہت نازک ہے، لیکن انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ خلوص برتا ہے۔ انھوں نے ناولٹ کے واقعات کوایک فنکار کی نظر سے دیکھا ہے اور ایک فنکار ہی کی حیثیت سے پیش بھی کیا ہے۔مصنفہ نے نہایت چابکدستی سے پلاٹ اور کرداروں کے ارتقامیں ایک مخصوص نفسیاتی کیفیت کی کارفرمائی کی ہے جس کے نتیجے میں اس صورتِ حال کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہوگیا تھا جوعلامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیری بن کر سامنے آئی۔

ذوق حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد

عشق فریب می دہد جان امید وارِرا

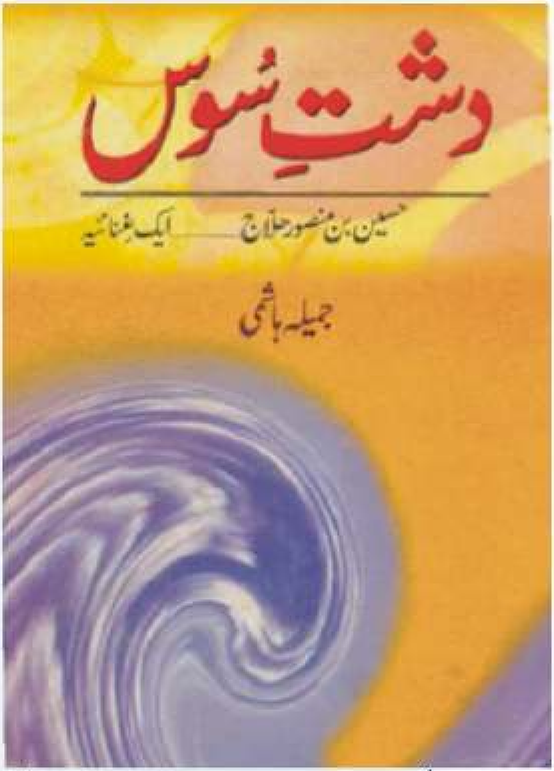

جمیلہ ہاشمی نے صفوی حکمرانوں اور شاہ قاچار کے دور کے ایران کی مذہبی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی اور ماحول پر ان کے اثرات کو ناولٹ کے پلاٹ میں نہایت خوبصورتی سے سمویا ہے۔

ناولٹ کے کرداروں میں زندگی اور اثرانگیزی ہے، مصنفہ نے شیخ احمد احسائی اوران کے شاگرد رشید سید کاظم رشتی کی تصویریں نسبتاً مختصر خطوط کے ذریعے بنائی ہیں مگر یہ اپنی اثر انگریزی کے اعتبار سے اہم کردار ہیں کیوں کہ ان کے فلسفے اور تعلیمات نے رفتہ رفتہ ایک مخصوص نفسیاتی فضا پیدا کر کے ایک نئے فرقے کے لیے فکری بنیاد فراہم کی۔ اُمِ سلمہ (قرۃ العین

طاہرہ) بھی انھیں سے متاثر ہوئی۔

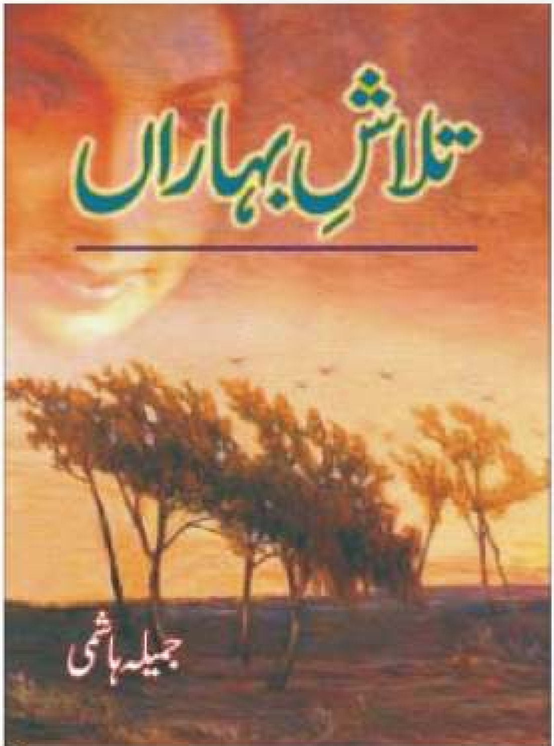

مصنفہ نے اُمّ سلمہ کے کردار پر بہت زور صرف کیا ہے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی ہے جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے، ایران کی بابی تحریک جو بے حد مشہور رہی اور اب بھی دنیا کے کئی کونوں میں اس کے آثار ملتے ہیں اس تحریک کا مرکز محور ''قرۃ العین طاہرہ'' ہے جو اپنے والہانہ جوش اپنے ساحرانہ حسن و جمال اور غیر معمولی عزم وثبات کے لحاظ سے میرابائی اور جون آف آرک کی صف میں آتی ہے۔ قرۃ العین کی تاریخ ولادت صحیح طور پر نہیں معلوم اور نہ ان کی زندگی کے مسلسل واقعات کہیں ملتے ہیں لیکن دو باتیں بالکل یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حد درجہ حسین تھیں اور دوسرے یہ کہ بابی تحریک پر قربان ہوگئیں۔ اُم سلمٰی جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش میں ہی جان دے دی۔ رسم پرست عورت ہوتے ہوئے بھی اس نے وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدروں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انھیں سوال بنا کر معاشرے کے شعور کو بیدار کر دیا۔

ام سلمٰی جو ام سلمٰی سے قرۃ العین بنی، قرۃ العین سے طاہرہ بنی، طاہرہ سے زرین تاج بنی اور پھر ام العالمین بن گئی۔ وہ قزوین کے ایک مجتہد کی بیٹی اور ایک مجتہد کی بہو ہے اس کا شوہر ام واد ہے وہ بھی مجتہد ہے۔

اُم سلمٰی عبادات میں مشغول رہنے والی اور مراقبوں اور مجاہدوں کی سختیاں جھیلنے والی لڑکی ہے وہ ملکی دستور کے خلاف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور فلسفے سے شغف رکھتی ہے۔ وہ الٰہیات کے مسائل پر غور وخوض کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ حسین نرم ونازک ہے، شاعرہ ہے اور موسیقی سے دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر اس کی روح تشنہ ہے۔ شیخ احمد احسائی کے فلسفے اور سید کاظم رشتی کی تعلیمات نے اس کی روح میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ وہ نہایت بے تابی سے ظہورِ آل محمد کی منتظر ہے۔ ایک اقتباس پیش ہے:

> ''مگر رویا کا کیا اعتبار'' ام سلمٰی نے دل میں سوچا اور یہ لڑکیاں اس کے دل میں لگی آگ اور اس نار میں جلتے اس کے وجود اس کے ذوق وشوق اس کی بے چینی کو سمجھ سکتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں یوں نہیں چرچا ہو رہا ہے لوگ جب ایک شے کو سراہنے لگتے ہیں تو بنا سمجھے اس پر سر دھنتے جاتے ہیں۔ بھلا انھیں کیا خبر ہے کہ میں کس کی منتظر ہوں۔ انھیں کیا معلوم کسی ساقی کا مجھے انتظار ہے۔ اس۔۔۔ جہنم کی ایک جھلک بھی تو انھیں دکھائی نہیں دے سکتی۔''

(چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، ص 11)

وہ ایک خواب مسلسل دیکھتی ہے۔ یہ ایک شخص جس کا چہرہ نقاب میں رہتا ہے۔ وہ شخص دکھائی بھی دیتا ہے، نہیں بھی۔ وہ اس کی آرزوؤں، جستجو، شاعری اور مذہبی معتقدات کا مرکز بن گیا ہے۔ اس کو دیکھنے، اس کو پا لینے کی آرزو میں وہ کیا سے کیا بن جاتی ہے اور اپنی زندگی قربان کر دیتی ہے۔

مصنفہ نے علی محمد (باب اور محمد علی بادفروش) کے کردار بھی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیے ہیں۔ ان کے علاوہ ملا حسین بشروئی کا کردار بھی جاذبِ نظر ہے۔ ملا صالح (ام سلمٰی کا باپ) اور ملا تقی (ام سلمٰی کے چچا) کے کردار، انیسویں صدی عیسوی کے ایرانی مجتہدوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ ملا محمد (ملا تقی) کا بیٹا اور ام سلمٰی کا شوہر) ایک جیتا جاگتا کردار ہے مگر جب مصنفہ اسے ام سلمٰی کے مقابلے میں لاتی ہے تو کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملا محمد کے کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ناولٹ کے ضمنی کرداروں میں بعض ایسے کردار ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتے ہیں مگر پڑھنے والے کے دل ودماغ پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً حسین

صادق قافلہ سالار اور ام سلمیٰ کی خادمہ ہانی کے کردار۔

یہ ناولٹ جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے اس میں انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے ایک نئے موضوع کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا ہے اور اپنے فن کو نئے زمان ومکان سے روشناس کرایا ہے۔

اس موضوع پر اردو زبان میں پہلا افسانہ عزیز احمد نے قرۃ العین طاہرہ کو موضوع بنا کر 'زرین تاج' کے نام سے لکھا جو آج بھی اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہن انسانی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وہ لگن ہے جو لکھنے والوں کو ہر دم نئے سفر کے لیے آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے انجانی دنیا کو جاننے کی خواہش کا نام ہے اور انجانی چیزوں کو جاننا جمیلہ ہاشمی کا مزاج ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے لکھنے کا اپنا ایک منفرد انداز ہے اور ایک اچھے فنکار کی طرح انسان اور انسانی رشتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا ان کا اپنا ڈھنگ ہے۔ بقول جمیل جالبی:

''ان کے اسلوب پر جوزف کونر کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔''

(تھی جن سے گفتگو، از جمیل جالبی، نیا دور، خاص نمبر شمارہ نمبر 82-83)

''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' کے بعد جمیلہ ہاشمی نے ایک اور تاریخی ناول ''دشت سوس'' لکھا یہ ان کا آخری ناول ہے۔

دشتِ سوس میں جمیلہ ہاشمی نے تاریخ کے ایک اہم صوفی بزرگ حسین بن منصور حلاج کی داستان حیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں حسین بن منصور حلاج کے عہد کو تاریخی حقائق کے آئینے میں دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ حلاج کے نعرہ ''انا الحق'' کی جذباتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ موضوع بے حد مشکل بھی تھا اور پُر خطر بھی مگر جمیلہ ہاشمی نے بڑی کامیابی سے حلاج کی داستانِ حیات کو اپنے دلکش اسلوب کے سہارے اعلیٰ درجے کا ادبی ناول بنا دیا ہے۔ انھوں نے حسین بن منصور کی پُر اسرار شخصیت کو اس عہد کے پس منظر میں بڑی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جمیلہ ہاشمی نے بعد از تحقیق اس عہد کی مخصوص فضا کو بھی زندہ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی جذباتیت اور کسی حد تک شاعرانہ اسلوب بھی بے حد کارآمد ثابت ہوا ہے۔

دنیا کی بیشتر زبانوں میں منصور حلاج کی فکر، حق گوئی اور تصوف ایک استعارہ ہے اور بعض لوک کہانیوں کا موضوع بھی بنایا گیا ہے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی نے دشتِ سوس میں اس عظیم کردار کو بڑے نادر انداز میں پیش

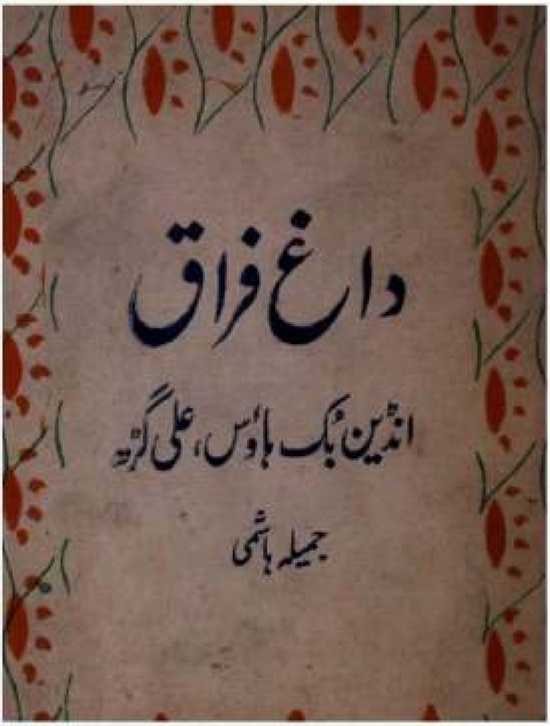

کیا ہے۔ تاریخی مسلمان اور مذہبی عقائد پر ناول لکھنا ایک مشکل کام ہے حلاج کو قصے کہانی کا موضوع بنانا مشکل تو ہے، کیونکہ مذہبی حلقوں میں ان کی ذات متنازعہ رہی ہے لیکن جمیلہ ہاشمی نے منصور حلاج جیسے گہری اور تہہ در تہہ شخصیت کو بڑی فنکاری سے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ حلاج تک پہنچنے کا راستہ تاریخ، تصوف اور معاشرت وتہذیب سے گزرتا ہوا ایک تاریخی عہد کی مکمل صورت پیش کرتا ہے۔ مصنفہ نے جس دلکشی سے اس ناول کی ابتدا کی ہے وہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور دوسری طرف خلافت عباسیہ کے جاہ وجلال کو آہستہ آہستہ ختم ہوتے دکھایا گیا ہے:

''سورج کی آخری کرن گلرنگ روشنی سے دھندلے سفید
اجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے نیلے اندھیرے میں
بدل رہی تھی۔''

(دشتِ سوس، از جمیلہ ہاشمی، ص8)

مصنفہ نے اس ناول میں لفظ ''دشت سوس'' جو خود گزرے وقت یعنی فارس کے قدیم دارالحکومت جہاں اس دور کے شاہی محل اور دیگر عمارتوں کے کھنڈر برآمد ہوئے ہیں جن میں دارائے اعظم کا محل بھی شامل ہے ۔ جو گزرتے وقت میں اس شان وشوکت کے ساتھ زوال کی بھی داستان ہے ۔ لفظ ''سوس'' کے نام سے مشہور ہوا۔ جمیلہ ہاشمی نے اسی

''سوس''یعنی فارس کے انھیں کھنڈرات کو اپنے ناول کی بنیاد بنا کر اس کہانی کا نام ''دشتِ سوس'' رکھا۔ جس کا مطلب وہ وقت ہے جو ایک طرف محلوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر چکا ہے اور جس کی دور تک پھیلی سرخ ریتیلی مٹی اپنے اس طرح ٹوٹ کر بکھرنے پر عبرت حاصل کرنے کا سبق دیتی ہے تو دوسری طرف پھر سے وہی وقت آنے کا پل پل اشارہ کرتی ہے اور جو خود اس سرزمین پر گزرے ہوئے وقت کا استعارہ ہے مصنفہ نے اس استعارہ کو اس ناول کے مرکزی کردار حسین بن منصور حلاج کی زندگی کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے یہ لفظ ''دشتِ سوس'' بطور استعارہ حلاج کی زندگی کے اول تا آخر بدلتی کیفیات کو اپنے اصل معنی یعنی اس سرخ ریتیلی مٹی کو وقت کی گردش سے بدلتے رنگ وحالات کے طور پر استعمال کیا ہے، جو حسین بن منصور کی اندرونی اور بیرونی کیفیات کے بیان کا بھی استعارہ ہے اور جس کا اندازہ ہمیں درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

> ''اس کی باتیں اور حرکتیں اور وہ بے پناہ آنکھیں عجیب ہوئیں۔ اس کی نگاہ سے اکثر گھبرا جایا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ تمھارے سینے کے اندر تک دیکھ رہا ہے۔ وہ ذرا سا معصوم بچہ، بس دیکھتا چلا جاتا۔ خاموش بس دیکھتا چلا جاتا۔ ایسے میں اسے ہنسانے کی جتنی بھی کوشش کرو وہ ذرا سا بھی نہیں ہنسے گا۔ جیسے وہ دلوں کے بھید جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ ورنہ صحن میں لڑھکنیاں کھاتا وہ کبھی رک جاتا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ پھر زمین کے کسی نقطے پر نگاہ مرکوز کر لیتا۔ پھر بھاگتا اور گرتا اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلاتا اور ضد کر اور چلا کر روتا اور کسی طور ہاتھ نہ آتا، بہلائے نہ بہلتا۔'' (دشت سوس، از جمیلہ ہاشمی، ص23)

جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج کے عہد کو اپنے تخیل کی معاونت سے حیات نو عطا کی ہے جو ناول ''دشتِ سوس'' میں یک مضطرب اور سیماب شخصیت کے کردار کو ایک مخصوص فکر و تناظر میں ابھارتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے دلکش، مرصع اور خوبصورت اسلوب میں ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے، جس میں تخیل کی مناسب پرواز کے لیے فضا کشادہ نہیں تھی، لیکن وہ ہمیں حسین بن منصور حلاج کے عہد میں اس طرح لا کھڑا کرتی ہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں اس دور کی عوام سانس لینے لگتی ہے۔

حسین بن منصور حلاج کا تعلق تیسری صدی کے اس عہد سے ہے جسے بجا طور پر خلافت بنو عباسی کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس صدی کی دوسری جہت ان کے (بنو عباس) کے زوال کی داستان ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے حلاج کے روحانی سفر کی داستان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ''صدائے ساز'' ''نغمہٴ شوق'' اور ''زمزمہٴ موت'' پہلے دو حصوں میں ابن منصور کے روحانی ارتقا کی داستان بیان کی گئی ہے جس سے ابن منصور کے بارے میں دو باتوں کا علم ہوتا ہے۔

ایک تو یہ کہ وہ بچپن سے ہی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے دوسرے یہ کہ حسین بن منصور کے دادا ''مجمی'' مذہب سے زرتشتی اور والد منصور اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے حصے میں حلاج کے بچپن کا زمانہ ابتدائی تعلیم، تُستر کی خانقاہ میں حضرت سہیل بن عبداللہ تُستری کی تعلیم اور پھر بصریٰ میں قیام، اس کی شادی، شیعہ مسلک سے اُنسیت وغیرہ کا بیان ہے۔

دوسرا حصہ ''نغمہ شوق'' نہایت طویل ہے یہ حلاج کے بغداد واپسی کے ساتھ شروع ہوتا ہے اس میں حلاج کی تجلی سامنے آتی ہے اور مختلف کشف و کرامات اس سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کی شخصیت کی ہر جہت سامنے نہیں آتی ہے۔ وہ راز کا راز بنا رہتا ہے اور عوام کی سمجھ سے باہر ہے اس کو لوگ مخفی طاقت کا سرچشمہ ماننے لگتے ہیں اسی سماجی اور مذہبی انتشار کے دور میں جب ہر شخص کو کسی روحانی رہنما کی تلاش تھی جس کی صفات و کرامات سے وہ مستفیض ہو سکے۔ بڑی تعداد میں لوگ حسین بن منصور کی ادارت میں داخل ہونے لگے۔ منصور حلاج کے تئیں لوگوں کی عقیدت کا حال جمیلہ ہاشمی نے جس طرح بیان کیا ہے اس سے منصور کی روحانیت کا اظہار ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک روحانی فضا سی معطر ہو جاتی ہے:

> ''وہ حاجتوں کا رواں کرنے والا، دعا کرنے والا، رازوں کا جاننے والا کہلایا جانے لگا تھا۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا اس کا مقدر بدل جاتا تھا محلوں اور عمارتوں میں پیدل سواریوں پر عمر رسیدہ اور جوان دوشیزائیں اور ازدواج، بیمار اور تندرست، مغموم اور خوش شہزادوں اور گداگر، اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی دلوں کا بھید جان لیتا۔ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بتا دیتے۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔''

(دشت سوس، ص263)

یہ سب کچھ حسین بن منصور حلاج کے دور کا تاریخی پس منظر ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں حسین بن منصور حلاج کی متصوفانہ شخصیت کو جوں کا توں قبول کیا ہے اور اس کے روحانی سفر کو تخلیقی اور تاثراتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے متلاطم جذبات پر اپنی

گرفت مضبوط کی ہے اور ناول کا بیانیہ اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ منصور حلاج اپنی تمام تر معنویتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور اس کی شخصیت کے گرد پھیلا ہوا اسرار مزید پُر اسرار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناول کا تارو پود کچھ اس فن کاری سے بنا ہے کہ صداقت کی سادگی نے ناول کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی حتی کہ وجدانی کیفیت بھی عقلی توازن قائم رکھنے میں مناسب معاونت کرتی نظر آتی ہے۔

’’دشت سوس‘‘ کا تیسرا حصہ ’’زمزمۂ موت‘‘ ہے۔ جس میں کہانی منصور کی موت کے ساتھ کلائمکس پر پہنچتی ہے۔ اس میں ابنِ منصور کے جنون کی کیفیت کا بیان ہے جب وہ خود کو اناالحق کہنے لگتا ہے۔ اس پر شعبدہ بازی کا الزام لگتا ہے اس کے خدائی دعوے پر اہل شریعت اور اہل طریقت کے حلقوں میں غم پیدا ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ طریقت کے اعلیٰ منصب پر فائز عبداللہ تشتری جو حلاج کے استاد بھی تھے اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے اس کو دیوانہ قرار دے کر اپنے حلقے میں شامل کرنے سے انکار کردیا تھا اور دوسرے بزرگوں نے ہمدردی رکھنے کے باوجود شرعی ملاحوں کی طرح اناالحق کا دعویٰ کرنے پر موت کی سزا سے اتفاق کیا تھا۔ یہ ایک واضح حقیقت تھی جس کا فائدہ وزیر مملکت اٹھالیتا ہے اور اپنی سیاسی طاقت کو استعمال کر کے اپنی رقابت کا بدلہ لیتا ہے۔ یہ رقابت اس حقیقت کے انکشاف سے شروع ہوتی ہے کہ حامل کی منظور نظر کنیز ’’اغول‘‘ جسے اس نے اپنے حرم میں شامل کرلیا تھا حسین بن منصور کے عشق میں گرفتار تھی اور اپنی موت کے وقت ابن منصور کے قریب تھی۔ خلیفۂ وقت اس انکشاف کو برداشت نہیں کر پاتا اور ابن منصور کی ہلاکت کے لیے اپنی تمام ریشہ دوانیوں کو کام میں لاتا ہے اور بالآخر حسین ابن منصور کو سزائے موت دی جاتی ہے۔

’’دشت سوس‘‘ ایک دلچسپ ناول ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حسین ابن منصور کی ذات اردو ادب اور شاعری کے لیے نئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس شخصیت کو موضوع بنا کر لکھا گیا ناول فطری طور پر ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ناول کی دلچسپی کی نوعیت داستانوں کی دلچسپی سے ملتی جلتی ہے جہاں ہم ایک ایسی کائنات میں داخل ہوجاتے ہیں جہاں سب کچھ ممکن ہے۔ ابن منصور ابتدا سے انتہا تک کسی غیر معمولی طاقت کا مالک یا اسیر نظر آتا ہے۔ ابتدا سے ہی کہانی کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے جسے بہت حد تک داستانی پیٹرن کہہ سکتے ہیں۔ اس ناول سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں ابن منصور کے عشق کی ماہیت یا نوعیت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر اس کے ذہنی اور روحانی اضطراب اور مابعد الطبیعیاتی تجربات کی صداقت پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے پہلے ناول ’’تلاش بہاراں‘‘ کے برخلاف ’’چہرہ بہ چہرہ روبہ رو‘‘ اور ’’دشت سوس‘‘ کی پیش کش میں ایک اضطرابی کیفیت ملتی ہے۔ ’’تلاش بہاراں‘‘ کی طرح شعریت بجائے خود مقصد نہیں ہے بلکہ موضوع کی مناسبت سے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ اور حسین ابن منصور کے نیم فلسفیانہ اور شاعرانہ کردار کی تجسیم اور ان کے سحر انگیز ماحول کی تعبیر کے لیے اسی طرز کی ضرورت تھی۔

بحیثیت مجموعی ’’چہرہ بہ چہرہ روبہ رو‘‘ اور ’’دشت سوس‘‘، ’’تلاش بہاراں‘‘ کے مقابلے میں زیادہ اہم تخلیق ہے۔ حسین ابن منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ سے جمیلہ ہاشمی کی رومانی بصیرت نے وہ کردار منتخب کیے ہیں جو سراسر آگ ہیں جن کی سوانح اور شخصیت ان استعاروں میں ڈھل گئی ہے جن کی ہر سطح پر آگ کی چمک اور حرارت موجود ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اسے اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے اور زیادہ چمکا دیا ہے۔

□□□

Saba Anjum
Ph.D Scholar
45/B3, SRM Flat , Near Tikona Park
Jamia Nagar Okhla
New Delhi-110025

ثنا غزل

حیات اللہ انصاری

کے افسانوں میں بچوں کے مسائل کی عکاسی

حیات اللہ انصاری ایک مشہور ترقی پسند افسانہ نگار، ممتاز ناول نویس، نقاد اور صحافی رہے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تین ناول 'لہو کے پھول' 1969، 'مدار' 1981 اور 'گھروندا' 1982 میں تصنیف کیے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے 'انوکھی مصیبت'، 'بھرے بازار میں' 1935، 'شکستہ کنگورے'، 1946، 'ٹھکانہ 1992 میں منظرِ عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ''جدیدیت کی سیر'' کے عنوان سے تنقیدی کتاب 1987 میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ وہ 'قومی آواز' کے مدیر بھی رہے۔ اس سے قبل وہ ہفتہ وار ''ہندوستان'' (72-1937) کے مدیر رہ چکے تھے۔ بعد میں رسالہ ''سب ساتھ'' (85-1988) اور ''سچ رنگ'' (90-1988) کے لیے خدمات دیں۔ 'لہو کے پھول' کے لیے 1970 میں ساہتیہ اکادمی انعام عطا ہوا۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ اردو کا سب سے طویل ناول ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے کم افسانے تخلیق کیے۔ لیکن ان کی تخلیقات ادبی حلقے میں سراہی گئیں۔ وہ قلیل سرمائے کے باوجود اپنی منفرد شخصیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کے مشہور افسانے آخری کوشش، ڈھائی سیر آٹا، شکستہ کنگورے، بھیک، ماں بیٹا، انوکھی مصیبت اور بھرے بازار میں ہیں۔ بقول اسلم جمشید پوری:

''آخری کوشش اردو کا لازوال افسانہ ہے۔ آخری کوشش کفن سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے''

(اکادمی، حیات اللہ انصاری نمبر، نومبر 2000 تا دسمبر 2001، ص 96)

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں بچوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اُن افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں بچے بطور اہم کردار کے یا ان کے مدمقابل کے طور پر شامل ہیں۔ میری نظر میں یہ افسانے توجہ کے مستحق ہیں، تاکہ بچوں کے کردار کو قارئین سے روبرو کیا جا سکے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں غربت میں پل رہے بچوں کی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان بچوں کی زندگی سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو مفلوک الحال ہیں اور سماجی اور معاشی بدحالی کے شکار ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں ڈھائی سیر آٹا، بھیک، بڈھا سودخور، وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

"حیات اللہ انصاری نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے کم افسانے تخلیق کیے۔ لیکن ان کی تخلیقات ادبی حلقے میں سراہی گئیں۔ وہ قلیل سرمائے کے باوجود اپنی منفرد شخصیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کے مشہور افسانے آخری کوشش، ڈھائی سیر آٹا، شکستہ کنگورے، بھیک، ماں بیٹا، انوکھی مصیبت اور بھرے بازار میں ہیں"

"حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سماج کے دبے کچلے طبقے کو اس کے صحیح سیاق میں حقیقی خدوخال کے ساتھ بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔"

(ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ 1936 سے 1965 تک، ڈاکٹر صادق (ص 170)

حیات اللہ انصاری نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ افسانوں میں اپنے عہد کی سچائی اور تلخ حقیقت کو پیش کر کے سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صادق مزید لکھتے ہیں کہ:

"1930 کے بعد جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے ان میں سے بیشتر افسانے نے زندگی کی تفسیر اور ترجمانی کا کام کیا اور حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔"

(ایضاً ص 168)

حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات پر کامل دسترس حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت، دردمندی اور انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال ان کے افسانے 'ماں بیٹا' اور 'موزوں کا کارخانہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم ان کے چند ایسے افسانوں کا جائزہ لیں گے جن میں بچے خاص کردار کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ "بڈھا سودخوار" جون 1930 میں رسالہ "جامعہ" میں شائع ہوا۔ اس میں انسانوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ:

"بڈھا سودخوار قاری کے ذہن میں استحصال کے خلاف ایک خاموش جلوس کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔"

(حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات مرتب ڈاکٹر عشرت ناہید ص 49 (بڈھا سودخوار)

"بڈھا سودخوار" کا اہم کردار سدھارمل ہے جو مستقبل کی فکر میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کو اذیت پہنچاتا ہے۔ پیسہ بچانے کی فکر میں اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے۔ بیوی 'سیتلا' کے سخت اور شدید بخار میں ہونے کے باوجود اس کے لیے عرق منگوانے میں آنا کانی کرتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود کا علاج بھی نہیں کرتا کہ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ درد کی وجہ سے لنگڑا کر چلتا ہے لیکن اس کے نزدیک دوا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

"فائدہ دینا نہ دینا تو بھگوان کے اختیار میں ہے۔ لوگ سینکڑوں روپے دواؤں میں خرچ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالہ جگن ناتھ کہتے تھے کہ ایک دفع ان کے گاؤں میں بخار پھیلا، آدھا گاؤں تہس نہس ہوگیا۔ کسی ڈاکٹر وید کے کیے کچھ نہ ہوسکا تب کہیں سے ایک سادھوں آگیا جس نے لوگوں کو گولر کے پتے بتائے۔ لوگوں نے پینا شروع کیے۔ آٹھ ہی دن میں سب چنگے ہوگئے۔" (ایضاً ص 53)

راجو، سدارمل کا بیٹا ہے اس سے ماں کی بیماری دیکھی نہیں جاتی تو کہتا ہے کہ ڈاکٹر رام بہاری کو دکھا دیجئے ہومیو پیتھک کی دوائیں سستی مل جاتی ہیں۔ لیکن باپ کی دلیل کے آگے مجبور ہے:

"بیٹا علاج سے کچھ نہیں ہوتا۔ صحت ہونا بھگوان کی مرضی پر ہے۔ لالہ خوشحال چند نے ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیا مگر نہ اچھے ہوئے۔ علاج تو ایک بہانہ ہے۔"

(ایضاً ص 55)

اس افسانے میں بچوں کے دو کردار اہم ہیں۔ پہلی نو برس کی بچی "سندری" اور دوسرا اس کا بھائی "راجو" دونوں سدھارمل کے بچے ہیں۔ دونوں کا ذہن بالکل مختلف ہے۔ سندری اپنی ماں کا خوب خیال رکھتی ہے۔ اپنے بھائی اور باپ کو کھلانے کے بعد اگر کچھ بچا تو خود کھاتی ہے۔ لیکن راجو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ کتاب خریدنے کے بہانے سے کلب کے لیے پیسہ مانگتا ہے۔ پوری کے لیے چار آنہ لیتا ہے لیکن اس میں سے بھی دو آنہ بچا کر رکھ لیتا ہے۔ گھر میں جب راجو کھانا کھاتا ہے تو اپنی بہن سے سخت الفاظ میں کہتا ہے:

"سندری یہ باسی روٹیاں تجھ سے نہیں کھائی گئیں۔ ایک روٹی یہ بھی کھالی ہوتی۔ میں نے ہی پتا جی سے پیسے مانگے تھے اور

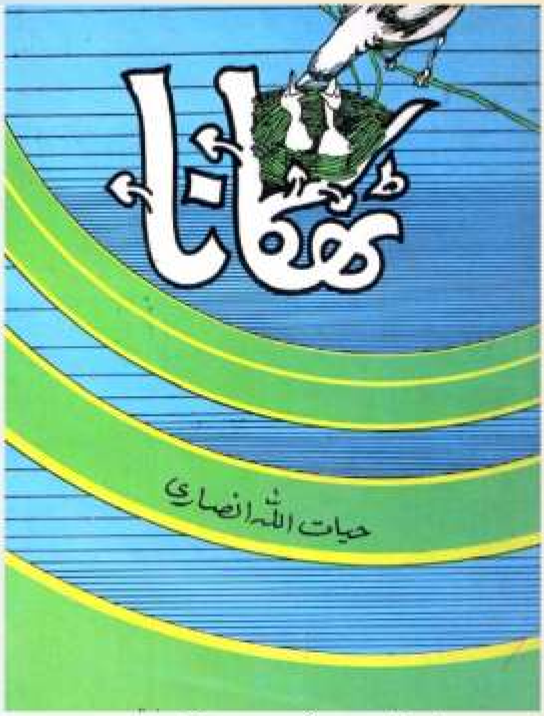

مجھ ہی کو یہ بھی کھانا پڑے گی۔ میں پیسے نہ مانگتا تو پھر مزا معلوم ہوتا۔ دن بھر بھوکی پڑی رہتیں۔'' (ایضاً،ص50)

سدھارمل اس قدر سخت جان اور بیٹا پرست ہے کہ اس کو اپنی بیٹی، بیوی کے دوا دارو پن تو دوران کے کھانے پینے تک کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن بیٹے کو کھانے کے لیے پوچھتا ہے۔ پہلے خود کھاتا ہے اور بچی ہوئی تین روٹی میں سے دو راجو کے لیے رکھ دیتا ہے۔ اپنی بیٹی سے پوچھتا بھی نہیں کہ اس نے کھایا یا نہیں یا وہ کیا کھائے گی۔ لیکن اس کو اپنی نو سال کی بچی کی شادی کی فکر ضرور ہے۔ بیٹی سندری کے کہنے پر بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی ہے:

''اچھا لو اس وقت کم ہی کھاؤں گا۔ دو روٹیاں اور یہ آلو راجو کے لیے رکھ دو۔'' (ایضاً،ص49)

بیٹی اور بیوی کی جانب سے اس قدر بے پرواہی، لیکن شادی کی فکر سماج کے لیے ایک ایسا المیہ ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔ یہاں بیٹی کی شادی کی فکر پہلے کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی بنیادی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسائل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

سندری کے کردار کو حیات اللہ انصاری نے بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ نو برس کی یہ بچی والدین کی خدمت گزار ہے۔ اسے سب سے زیادہ ماں کی فکر ہے۔ ہر وقت بیمار ماں کا خیال رکھتی ہے۔ ماں کی تکلیف کو دیکھ کر باپ سے کہتی ہے:

''پتا جی اماں کے لیے عرق منگوا دیجیے۔ پیاس بہت ہے پانی پیتی ہیں تو کلیجے میں لگتا ہے۔'' (ایضاً،ص289 (بھیک)

''ڈھائی سیر آٹا'' حیات اللہ انصاری کا اہم افسانہ ہے جس میں غریب بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ بھوکے بچوں کو کھانے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دانے اور نوالے کو ترستے ان بچوں کو چاول پکنے کی بدبداہٹ راگنی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن مولا کو سڑک پر گدھا ہوا آٹا ملا جسے ایک فقیرنی بھی پھینک کر چلی گئی تھی۔ ماں نے اس آٹے سے پوری بنائی اور گھر کے تمام افراد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اس دن بچے اپنی ماں سے کہتے ہیں ماں آج کہانی سناؤ، تو ماں نے بچوں کو شہزادے کی کہانی سنائی۔

ماہر نفسیات ماسلو نے انسانی ضروریات کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق جسمانی ضرورتیں سب سے اہم ہوتی ہیں۔ اس کی تکمیل کے بغیر انسان دیگر ضروریات کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ خالی پیٹ تو اللہ کی عبادت میں بھی مَن نہیں لگتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جاندار کی پہلی ضرورت پیٹ بھرنا ہے اس کے بعد ہی وہ کسی دیگر شے کے بارے میں سوچ سکے گا۔ افسانے میں بچے ماں سے اسی وقت کہانی سنانے کو کہتے ہیں جب ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ یعنی پیٹ بھرنا ہماری سب سے اولین ضرورت ہے۔ جب مولا گلی سے آٹا اٹھا رہا تھا تو کچھ مزدور اسے طعنہ دے رہے تھے کہ ہم غریب ہیں لیکن گلی کا گرا پڑا نہیں کھاتے۔ یہاں بھی مولا عزت نفس کی فکر نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک سوچنے سے معذور ہے جب تک اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہوں۔ خود تعزیمی اور عزت نفس تو بعد کی چیز ہے۔

حیات اللہ انصاری نے معاشرے میں پھیلے ان مسائل پر نظر ثانی کی ہے جس پر عام لوگوں کی نظر کم ٹھہرتی ہے۔ ان کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ معاشرے کی بے لاگ حقیقت کو پیش کر دیتے ہیں۔ زندگی کے اچھوتے پہلوؤں سے سماج کی برائیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جسے پڑھ کر قاری کے دل میں برائی سے نفرت پیدا ہو۔

افسانہ ''بھیک'' افسانوی مجموعے ''شکستہ کنگورے'' میں شامل ہے۔ اس میں اہم کردار رجنی نامی بچی کا ہے جس کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس ہے۔ غربت کی وجہ سے وہ کافی کمزور اور دبلی پتلی ہے۔ یہ بچی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا ماں کی طرح خیال رکھتی ہے۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے۔ رجنی ان بچوں کے ساتھ ایک کھنڈر میں بھوک، ڈر اور بے بسی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ کیلاش ان کی زندگی میں امید کی کرن بن کر آتا ہے۔ لیکن وہ بھی بچوں کی تعداد دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ صبح

جس امید کے ساتھ وہ کیلاش کے پاس جاتے ہیں شام تک ناامیدی اور مایوسی کے ساتھ واپس لوٹ آتے ہیں۔ جہاں بھوک، پیاس اور ڈر ان بچوں کا منتظر ہے۔ اس افسانہ میں حیات اللہ انصاری نے بچوں کے جذبات کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ جب ننھے منے بچوں کا قافلہ یاس و امید کے ساتھ چلتا ہے تو ان کی معصومانہ باتیں سن کر قاری کے دل میں جذبات کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"کلو۔ اوپر پپّا اور ماں ملیں گی۔"

منی۔ "نہیں۔ الو۔ وہ نہیں۔ وہ تو مر گئے۔"

کلو۔ "جو مرتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟"

منی۔ (بہت سنجیدگی سے) وہ کہیں نہیں ملتے۔ ہم لوگ ایک بابو جی کے پاس جا رہے ہیں جو پتا جی ہی کی طرح روٹی دیں گے۔ کپڑے دیں گے۔ اور اوڑھنے کو دیں گے۔"

(ایضاً، ص 291)

رجنی اس لیے مسرور ہے کہ اب اسے اور بہن بھائیوں کو کھانے پینے کے سامان اور کپڑے ملیں گے، اب انھیں وہاں پر کسی کا ڈر بھی نہیں ہوگا۔ خوشی سے سرشار یہ قافلہ پچاس فٹ سے زیادہ اونچا پہاڑ چڑھ جاتا ہے۔ کیلاش بچوں کی تعداد دیکھ کر غصے میں رجنی سے کہتا ہے کہ تم نے کل تو ایک بار بھی نہیں بتایا کی تمھارے پانچ بھائی بہن ہیں۔ تم اتنی بڑی فوج کو لے کر آئی ہو میں انھیں ہرگز نہیں رکھ سکتا، کیلاش کی باتیں رجنی کے سر پر بجلی بن کر گری۔ اسے اپنے بھائی بہنوں سے وقتی نفرت ہو جاتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان سارے بچوں کو مار ڈالے۔ اس جارحانہ کیفیات کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

"یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔ کلو تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔" (ایضاً، ص 214 (موزوں کا کارخانہ)

کیلاش کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا کہ بچوں کو خالی ہاتھ واپس کرے، لہٰذا اس نے رجنی کو پاس بلا کر دو روپے بھیک میں دے دیے۔ پیسہ لے کر رجنی بھائی بہنوں کے ساتھ بازار گئی اور سب نے پوری کھائی۔ پھر وہ دو روپیہ ختم کر کے اپنی اسی اندھیری دنیا میں چلے گئے جہاں بھوک کی شدت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس افسانے میں بچے ماں باپ کے پیار اور بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ انھیں بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان

"ڈھائی سیر آٹا" حیات اللہ انصاری کا اہم افسانہ ہے جس میں غریب بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ بھوکے بچوں کو کھانے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دانے اور نوالے کو ترستے ان بچوں کو چاول پکنے کی بد بداہٹ راگنی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن مولا کو سڑک پر گدھا ہوا آٹا ملا جسے ایک فقیرنی بھی پھینک کر چلی گئی تھی۔ ماں نے اس آٹے سے پُری بنائی اور گھر کے تمام افراد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اس دن بچے اپنی ماں سے کہتے ہیں ماں آج کہانی سنائو، تو ماں نے بچوں کو شہزادے کی کہانی سنائی"

تک میسر نہیں ہے۔ کیلاش کے یہاں سے ناامیدی ہاتھ لگنے پر وہ دوسری طرف ایک نئی امید سے نکل پڑتے ہیں۔

"موزوں کا کارخانہ" افسانوی مجموعے "شکستہ کنگورے" میں شامل ہے۔ اس میں تین برس کے لارنس کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا ہے۔ اس کی ماں اسے نوکر کے حوالے کر کے کام کرنے چلی جاتی ہے۔ لیکن نوکر بھی اسے کمرے میں بند کر دیتا ہے، تا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں باہر نہ چلا جائے۔ وہ بچہ صبح سے لے کر شام تک دروازے کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا تھا۔ اس کا ہر دن کا وہی معمول تھا وہ وہیں روتے روتے سو جاتا تھا۔

جب پروفیسر (کتاب لکھنے کے لیے) لانس کے فلیٹ میں گئے تو بچے کے رونے کی آواز سن کر پریشان ہوئے۔ انھیں دو دن میں ہی رونے کا مکمل ٹائم ٹیبل معلوم ہو گیا۔ جب ان کا تجسس حد سے بڑھا تو وہ بچے (لارنس) کو دیکھنے پہنچ گئے۔ اسے روتا دیکھ کر ان کے دل میں پیار کے جذبات امڈ آئے۔ وہ اس کو بلا کر پیار سے باتیں کرنے لگے۔ لارنس کی معصوم باتیں سن کر اسے خوب پیار کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"بتاؤ کیوں روتے ہو"

"رونا آ کر مجھے رلاتا ہے"

اس جواب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر پوچھا۔ رونا کہاں سے آتا ہے؟
بچے نے فوراً آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں سے''
پھر اسے خیال آیا کہ وہ غلط کہہ رہا ہے اور منہ کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''نہیں نہیں۔ یہاں سے۔'' لیکن فوراً اس کی غلطی کی بھی تصحیح کی اور پھر آنکھوں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''نہیں نہیں دیکھیے یہیں ہے۔''
مجھے پھر ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ '' رونا آتا کیوں ہے؟'' بچے نے برجستہ جواب دیا۔
''مجھے رلانے کے لیے'' (ایضاً،ص217)

لارنس سے گفتگو کرنا انھیں بھلا معلوم ہوا۔ پہلے وہ اس کے رونے سے پریشان ہوجاتے تھے۔ اب اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے لگے۔ ان کو احساس ہوگیا کہ بچہ صرف پیار کا بھوکا ہے۔ ان کو بچے سے انسیت ہو گئی۔ لارنس ان کی ساری باتیں ماننے لگا۔ جب وہ کمرے میں اپنے مسودے پر کام کرتے تو لارنس ان کو کھڑکی سے دیکھتا رہتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ان سے اتنا گھل مل گیا کہ ان کے کمرے پر کئی کئی چکر لگانے لگا۔ ایک رات وہ انکل کے پاس سونے کی ضد کرنے لگا۔ ماں اسے لے کر پروفیسر کے پاس گئی اور کہا کہ آج رات لارنس کو اپنے پاس سلا لیجیے۔ لارنس انکل کی جانب امید اور ڈر کے ساتھ دیکھتا رہا کہ کہیں انکل خفا نہ ہو جائیں۔ لیکن جب انکل اس کو گود میں اٹھا لیتے ہیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے پھر گلے میں باہیں ڈال کر معصومانہ انداز میں کہتا ہے:

''میں بالکل نہیں بولوں گا۔ آپ کو کام کرنے دوں گا۔ آپ کی چیزیں بھی نہیں چھوؤں گا۔ پانی خود اٹھا کر پی لوں گا۔ باتھ روم بھی خود چلا جاؤں گا۔'' (ایضاً،ص218)

جاتے ہوئے لارنس کی ماں اپنی تکلیف اور غم کا بیان ان الفاظ میں کرتی ہے:

''ایک بات میں اور کہہ دوں پروفیسر صاحب جو میرے دل پر پتھر کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ اس کے باپ نے مجھے بلاوجہ طلاق دی اور اب جس طرح بنتا ہے اپنا اور اس کا پیٹ پالتی ہوں۔'' (ایضاً،ص276 (ماں بیٹا)

ماں اور بچے کی بات سن کر قاری کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ماں اپنے بچے کو کمرے میں بند کر کے جاتی ہے۔ اس افسانے میں حیات اللہ انصاری نے ایک ایسی ماں کی سچائی کو پیش کیا ہے جس کا اس کے بچے کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

حیات اللہ انصاری کا ایک افسانہ ''ماں بیٹا'' ہے جو تقسیم کے بعد ہوئے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کا خاص کردار ''مومنہ'' نامی عورت ہے۔ فسادیوں نے اس کے گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے سامنے ماں، باپ، شوہر اور بچی کو قتل کر دیا گیا۔

افسانے میں ''آشا'' نام کی کتیا ہے جو مومنہ کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔ مومنہ جب وہاں جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ ایک چھ سال کا معصوم بچہ ''رامو'' آگ میں جھلسا ہوا زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے وہ کھسک کر پرنالے کے نیچے گڈھے کو ٹٹول کر پانی تلاش کر رہا ہے۔ وہ درد سے کراہ کراہ کر ہائے ماں کی آواز نکال رہا ہے۔ لفظ 'ماں' سن کر مومنہ کی ممتا امڈ آئی۔

حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت ہے، بچوں کی نفسیات پر بھی ان کو مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں فن، تکنیک اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اسلوب کی وجہ سے وہ افسانوی ادب کی دنیا میں ہمیشہ ایک ستارے کی طرح چمکتے رہیں گے۔

☐☐☐

Sana Ghazal
Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500 032 (Telangana)

شیریں نیازی

ہیرا کس کا؟

ایک فقیر تھکا ہارا اکیلا تنہا اپنے راستے سے الگ انجانی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے بال اور داڑھی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے، ہونٹ سوکھے ہوئے، اس کی قمیص کا دامن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کے جوتوں کے تلے میں چلتے چلتے چھید ہو گئے تھے اور جوتا سامنے سے پھٹا ہوا تھا۔

وہ اپنے قافلے کے ساتھ سفر پر نکلا تھا اور راستے میں طوفانی ہواؤں کی چپیٹ میں آ کر الگ الگ بکھر گئے تھے۔ دھول کے بادل اور رات کے اندھیرے نے ان سب لوگوں کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا اور اب آدھی رات گزر گئی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کس دشا میں جا رہا ہے۔

چلتے چلتے راستے میں اسے ایک آدمی ملا تھا اس آدمی سے اس نے اس جگہ کا نام پوچھا تو وہ بولا۔ ’اس رستے کا نام تو مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر سنا ہے اس راستے کی پورب دشا میں ایک بہت بڑا دیش ہے اور اس دیش پر ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ اس کی سلطنت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر وہ خود بڑی سادگی سے رہتا ہے۔ ایسا کرو تم پورب دشا کی طرف چلے جاؤ شاید تمہارا راستہ تمہیں مل جائے۔‘

فقیر پورب دشا کی طرف مڑ گیا۔ بھوک اور پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا۔ پیروں میں درد کی ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں بار بار بند ہو جاتی تھیں۔ لیکن وہ گرتا سنبھلتا رات کے تیسرے پہر تک بادشاہ کے محل تک جا پہنچا۔

محل کے باہری صحن میں ایک بزرگ صورت شخص ہلکی روشنی میں ٹوپی سی رہا تھا۔ دو تین ٹوپیاں اس کے آس پاس کاٹ کر رکھی ہوئی تھیں۔

فقیر نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس نے بڑے پیار سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ’تم کون ہو بھائی اور اتنی رات گئے یہاں کیسے آئے۔؟‘

’محترم میں اپنے قافلے سے بچھڑ گیا ہوں راستے میں آندھی اور طوفان نے ہمیں اپنی چپیٹ میں لے لیا تھا ہم سال میں دو بار روٹی کی تلاش میں ایک دشا سے دوسری دشا میں سفر کرتے ہیں۔ لیکن اس بار میں ایسی دشا میں آ گیا ہوں جہاں سے اپنی منزل تک پہنچنے اور اپنے ساتھیوں سے ملنے کا راستہ مجھے نہیں مل رہا ہے۔ میں بھوکا اور پیاسا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں۔ کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا مجھے مل جاتا تو میں اسے کھا کر پانی پی لیتا۔ میرے جسم کو تھوڑی توانائی مل جاتی تو میں پھر سے اپنی منزل کی تلاش میں جٹ جاتا۔

”چلتے چلتے راستے میں اسے ایک آدمی ملا تھا اس آدمی سے اس نے اس جگہ کا نام پوچھا تو وہ بولا۔’ اس رستے کا نام تو مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر سنا ہے اس راستے کی پورب دشا میں ایک بہت بڑا دیش ہے اور اس دیش پر ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ اس کی سلطنت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر وہ خود بڑی سادگی سے رہتا ہے۔ ایسا کرو تم پورب دشا کی طرف چلے جاؤ شاید تمہارا راستہ تمہیں مل جائے“

ٹوپی سیتے شخص نے اب ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا۔

’سچ مچ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ لیکن افسوس رات کے اس پہر میں تمہارے کھانے کا انتظام نہیں کرسکتا۔ شاہی باورچی خانہ بند ہو چکا ہے سارے باورچی اپنے اپنے گھروں میں آرام کرنے چلے گئے ہیں اور اپنے حصے کی روٹی تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے کھا کر ختم کر چکا تھا۔ ہاں میری صراحی میں یہ تھوڑا سا پانی بچا ہوا ہے تم چاہو تو اسے پی لو۔

’فقیر پانی پی کر خود کو تھوڑا تازہ دم محسوس کرنے لگا تو اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ سنا ہے یہاں ایک بہت بڑے بادشاہ کی حکومت ہے۔‘

’ٹوپی سیتے شخص نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

’ہاں۔ حکومت ہے تو سہی لیکن دن میں۔ جب تک دربار کا کام ہوتا رہتا ہے تب تک۔ رات ہوتے ہی وہ اس تمام عالم کے بادشاہ کے حضور میں سر جھکا دیتا ہے۔ اس کے بعد چند گھنٹے اپنی محنت کی روٹی حاصل کرنے میں جٹ جاتا ہے۔ مگر تم اپنے راستے سے بچھڑے ہوئے تھکے ہارے مسافر ہو۔ ہمارے مہمان ہو اور میرے پاس تمہیں کھلانے کے لیے روٹی نہیں ہے صرف ایک اکنی بچی ہوئی ہے۔ تم ایسا کرو یہ ایک اکنی لے لو اور جا کر کسی دکان سے کچھ لے کر کھالو۔ صبح جب دربار لگے گا تب محل میں آجانا۔ بادشاہ سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔

فقیر نے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ کیا اتنے پیسے میں یہاں کچھ مل سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک آنہ شاید تمہاری ہی قسمت سے میرے پاس بچ گیا تھا۔ کیونکہ گزرے دن میں میری پانچ ٹوپیاں بک گئیں۔ ورنہ ہر روز چار تک ہی بکتی ہیں۔ ان چار ٹوپیوں کی قیمت 4 آنے ہوتی ہے۔ اس میں سے اپنی کمائی کے تین آنے میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں۔ ایک آنے میں اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ آج اتفاق سے پانچ ٹوپیاں بکیں اور یہ ایک آنہ بچ گیا جو دونوں جہاں کے مالک نے تمہیں دلوادیا۔‘

فقیر حیرانی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اچانک پوچھ لیا۔’ مگر آپ اس نیم اندھیرے میں سلائی کا کام کیوں کرتے ہیں۔‘

’کیونکہ دن میں مجھے بہت کام ہوتا ہے۔ رات کے پہلے پہر میں عبادت کرتا ہوں۔ دوسرے پہر تھوڑا سو لیتا ہوں۔ تیسرے پہر ٹوپیاں سلتا ہوں۔ چوتھے پہر یعنی بھور کا تارا نکلنے کے بعد اس مالک کے سامنے جھکتا ہوں جو ساری دنیا کو چلانے والا ہے اور سورج کی پہلی کرن جب مسکراتی ہے تو ٹوپیاں بیچنے نکل جاتا ہوں۔ پھر مجھے دربار میں حاضری لگانی پڑتی ہے۔ درباری کاموں کا سلسلہ دن بھر چلتا ہے۔ اور پھر...... اچھا مسافر اب تم جاؤ اور کچھ کھالو۔ صبح جب دربار لگے وہاں آجانا۔‘

فقیر ہاتھ میں اکنی سنبھالے یہ سوچتا ہوا وہاں سے نکل آیا کہ اس ایک اکنی میں اسے کیا مل سکتا ہے اور اس سے اس کا پیٹ بھر جائے گا؟

بازار کے آخری سرے پر اسے ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا تو وہ اسی طرف بڑھ گیا۔

’باباجی۔ کیا تم ایک مچھلی خرید لو گے؟‘

’مچھلی......!‘ لیکن...... میرے پاس تو پیسے......

’آپ کے پاس جو بھی ہے وہ دے دیجیے۔ میں بہت دیر سے کسی گاہک کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے، بیوی بچے میرے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ میں اس مچھلی کو پھینک نہیں سکتا۔ کیونکہ بہت محنت سے پکڑی ہے اور واپس اسے گھر بھی نہیں لے جاسکتا کیونکہ میرے راستے پر رات میں نہ جانے کہاں کہاں سے آکر کتے جمع ہو جاتے ہیں۔ مچھلی کی مہک پاتے ہی وہ مجھے پھاڑ کھائیں گے۔‘ بابا میں بہت الجھن میں ہوں۔

”لیکن بھائی...... میری بات بھی تو سنو۔ میں خود راستے سے بھٹکا ہوا ایک مسافر ہوں، بھوکا بھی ہوں۔ لیکن میرے پاس صرف ایک اکنی ہے اور اس مچھلی کی قیمت آٹھ آنے سے کم نہ ہوگی۔

”بابا۔ آپ ایک آنے میں ہی اس مچھلی کو لے جایئے تاکہ میں اپنے گھر لوٹ جاؤں۔

مچھلی سینکنے کے لیے آپ کو سوکھی لکڑیاں بھی دے کر جاؤں گا۔ آپ مچھلی تو لے لو۔

فقیر نے وہ اکنی دے کر مچھلی خرید لی۔

مچھوارے نے اپنے چاقو سے مچھلی کو چھیل دیا اور اس کے پنکھ کاٹ دیے لیکن جب اس کا پیٹ چیر کر آنتیں نکالنے کا وقت آیا تو دونوں چکرا سے گئے۔

مچھلی کے پیٹ سے ایک بہت بڑا ہیرا نکل کر زمین پر اس طرح گرا جیسے

”فقیر نے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ کیا اتنے پیسے میں یہاں کچھ مل سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک آنہ شاید تمہاری ہی قسمت سے میرے پاس بچ گیا تھا۔ کیونکہ گزرے دن میں میری پانچ ٹوپیاں بک گئیں۔ ورنہ ہر روز چار تک ہی بکتی ہیں۔ان چار ٹوپیوں کی قیمت 4آنے ہوتی ہے۔ اس میں سے اپنی کمائی کے تین آنے میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں۔ ایک آنے میں اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ آج اتفاق سے پانچ ٹوپیاں بکیں اور یہ ایک آنہ بچ گیا جو دونوں جہاں کے مالک نے تمہیں دلوا دیا“

کسی نے آسمان سے نیچے پھینک دیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے دونوں کا دماغ سُن سا ہو گیا تھا۔ یہ ہیرا کیسا ہے اور کس کا ہے۔ پھر فقیر نے ہی خاموشی توڑی۔

’بیٹا اسے تم رکھ لو۔‘

’نہیں بابا...... یہ آپ کا ہے۔‘

’مگر میں نے تو اس مچھلی کی قیمت وہ بھی اس کی قیمت کا آٹھواں حصہ ہی دیا تھا۔‘

’مچھلی بھی تو اتنی دیر تک رکی رہی۔ اسے خریدنے کوئی گاہک نہیں آیا اوپر والے نے آپ ہی کے لیے تمام گاہکوں کے مت پھیر دیے کہ کوئی ادھر آیا ہی نہیں۔

’مگر یہ غلط ہوگا۔ ایک اکنی کے لیے۔

’اچھا بابا اسے اس کونے میں رکھ دیتے ہیں۔ اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے آپ اپنی بھوک تو مٹا لیں۔‘

فقیر بہت تھکا ہوا تھا آگ کی روشنی میں ان دونوں کو ایک گھنے درخت پر مچان جیسا نظر آیا تھا۔ وہ اسی پر چڑھ کر سو گیا۔ مچھوارا اپنے گھر لوٹ آیا۔

ان دونوں کے بیچ یہ بات طے ہوئی کہ اس کا فیصلہ صبح بادشاہ سلامت سے کرایا جائے گا۔

صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی فقیر کی آنکھ کھل گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے عبادت کی۔ اپنے مالک کا شکریہ ادا کیا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر رنگ برنگے پنچھیوں کو چہکارتے اور دانہ چگتے دیکھتا رہا۔

مچھوارا بھی وقت کے مطابق آ گیا پھر دونوں بادشاہ کے محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو دربار کی کارروائی شروع ہونے کو تھی اور چونکہ یہ لوگ پہلے پہنچ گئے تھے اس لیے پہلی پیشی ان ہی کی ہوئی۔

تخت پر بیٹھے بادشاہ پر نظر پڑتے ہی فقیر چونک اٹھا اور سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ اسے یہ صورت جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ مگر آواز سنتے ہی یقین ہو گیا اور پھر اس کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ ٹوپی، سوئی دھاگہ، صراحی کا پانی اور ایک اکنی۔ ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے مگر منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔

’فریادی حاضر ہوں...... آواز سنتے ہی سارے درباری ادب کے ساتھ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

مچھوارا آگے بڑھا ادب کے ساتھ بادشاہ کو سلامی دی اور پھر ساری بات بتا دی۔ اس نے یہ بتایا کہ بابا کی حالت ایسی کیوں ہو گئی ہے۔ وہ اس لیے کہ اس نے آپ کے ساتھ ذرا جھلاہٹ سے بات کی تھی۔ آپ کو تم کہہ کر بلایا تھا اور آپ کی دی ہوئی اکنی کو گری ہوئی نظر سے دیکھا تھا کہ یہ ایک اکنی کیا اس کا پیٹ بھر سکے گی؟ حضور کی خدمت میں یہ پہلی بار حاضر ہوا ہے۔ اب اس ہیرے کا مسئلہ ہے حضور کا جو فیصلہ ہوگا وہ اسے منظور ہوگا۔

کچھ دیر دربار میں خاموشی رہی پھر ایک گمبھیر آواز سنائی دی۔

’اس ہیرے پر فقیر بابا کا ہی حق ہے۔ اگر اوپر والے نے ان کی قسمت میں یہ چیز لکھی نہ ہوتی تو ایسا نہ ہوتا کہ آدھی رات تک صرف ایک مچھلی ان کے انتظار میں رکی نہ رہتی۔

’اور ہاں تمہیں بھی اس ہیرے کی قیمت کے برابر انعام سے نوازا جائے گا۔ تم چاہتے تو بابا کو دھوکہ دے سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔‘

’لیکن بابا۔ آپ کے لیے یہ شرط ہے کہ اب آپ گلی گلی، شہر شہر گھوم کر بھیک نہ مانگیں۔ اس ہیرے کی قیمت سے کچھ زمین اور ہل بیل خرید لیں، خود بھی محنت کریں اور ان کے گھر میں جو بھی بالغ آدمی ہو اس سے بھی محنت کرائیں۔

محنت کی روٹی سے اچھی دنیا کی کوئی نعمت نہیں ہوتی!!

□□□

Mrs. Sheerin Niyazi

Teacher's Colony, P.O. River Side

Bhurkunda

Dist. Ramgarh-829135 (Jharkhand)

سلمیٰ حجاب

دادی گیری

’کیوں دادی اماں ہمارے ساتھ کیوں نہیں جاسکتیں۔‘؟ ماں نے دیکھا بیٹا قد میں ان کے برابر ہو ہی گیا، آج لہجے میں تھوڑی سختی بھی آ گئی تھی۔

’وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جاسکتیں......؟‘ بیٹے نے سوال دہرا دیا۔

’میں کب تک وہی جواب دہراتی رہوں۔ بتا چکی ہوں۔‘

’آپ نے کوئی خاص وجہ نہیں بتائی می!‘

’تم کیوں ضد کر رہے ہو۔؟‘

’آپ جانتی ہیں میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے بغیر میرے کام نہیں ہوتے۔‘

’کام......؟ کون سے کام‘ ماں نے ذرا طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

’ارے آپ نہیں جانتیں۔ میرے تو سارے کام وہی کرتی ہیں۔ سچ می جب تک دادی اماں میرے ماتھے پر پیار نہ کریں، میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی نہ کریں، صبح میری آنکھ نہیں کھلتی اور پھر وہ میری میز ٹھیک کرتی ہیں، میرا ہوم ورک کرواتی ہیں، اپنے ہاتھوں سے حلوا بنا کر کھلاتی ہیں۔ میرے ساتھ کھیلتی ہیں، کہانیاں پڑھ کے سناتی ہیں۔ آپ کو تو فرصت ملتی نہیں۔ ایک بات بتاؤں‘۔ یہ کہتے کہتے وہ رک سا گیا۔

وہ بات یہ کہ جب آپ یا ابو مجھے ڈانٹتے یا سزا دیتے ہیں تو انھیں کی گود میں لیٹ کر روتا ہوں۔ بس۔ میں کچھ نہیں جانتا وہ بھی میرے ساتھ چلیں گی۔ اور......!‘

نعیم نے باپ کو آتا دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بیوی نے شوہر کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔

’کیا مسئلہ ہے بھئی۔؟‘ باپ نے بیٹے کو اپنی باہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے پوچھا۔

مضبوط اور کرخت ہاتھوں کی گرمی نعیم کو تھوڑا پگھلا گئی۔

’ابو میں کہہ رہا تھا کہ دادی اماں بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔‘

’بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سارہ بھئی اپنا بیٹا تو بڑی عقلمندی کی باتیں کرنے لگا ہے۔‘ دنیا آگ کو پانی سے بجھاتی ہے وہ آگ پر برف رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

’پھر بھی آپ میری بات نہیں مانتے۔‘ بیٹے نے باپ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

’ہم تمھاری بات ضرور مانتے مگر کچھ بندشیں ہیں، مجبوریاں ہیں......‘

’کیسی مجبوری......؟ بچپن کی ضد کسی مجبوری اور مصلحت سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھی۔

’آپ ابھی ناسمجھ ہیں۔ ساری باتیں نہ آپ کو بتائی جاسکتی ہیں نا آپ کی سمجھ میں آئیں گی۔‘

’تو کیا وہ یہاں رہیں گی۔ اس گھر میں اکیلی۔؟‘

’نہیں نہیں ان کے لیے دوسرے گھر کا انتظام ہو گیا ہے، بھئی۔ تم پریشان نہ ہو۔‘

نعیم کا ذہن اپنی سمجھ اور ناسمجھی میں الجھ گیا۔ وہ اپنی سمجھ کے قد کو ناپنے لگا۔ ابھی تو میں ابو کے کندھوں تک پہنچا ہوں۔ مجھ سے چھ انچ اونچی ہے ابو کی عقل، ابو کا دماغ اسی لیے وہ مجھے ناسمجھ کر کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر میں ناسمجھ ہوں تو میڈم روز کلاس میں کیوں کہتی ہیں کہ نعیم بہت سمجھدار بچہ ہے، کیا وہ جھوٹ بولتی ہیں۔ نعیم اب اسی مسئلے میں الجھ گیا تھا۔

رات میں وہ سونے کے لیے لیٹا تو سرک کر دادی کے قریب پہنچ گیا اور ہمیشہ کی طرح دن بھر کی روداد دادی کو سنا دی۔ لیکن آج دادی کچھ بھی جواب دیے بغیر خاموشی سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی رہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دادی اماں ابو کو حکم دے دیں تب بھی کیا ابو نہیں مانیں گے۔ کیوں نہیں مانیں گے بالکل مانیں گے مجھ سے تو وہ روز کہتے ہیں ماں کا کہنا مانا کرو اور ممی دن بھر مجھے آرڈر دیا کرتی ہیں۔ پھر دادی ابو کو آرڈر کیوں نہیں دیتیں؟ اپنے باپ سے باتیں کرتا ہوا وہ دادی کی خاموشی سے الجھنے لگا اور نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اگلے دن روانگی تھی۔ آفس کی طرف سے اس کے ابو کو دو سال کے لیے آن ڈیپوٹیشن امریکہ بھیجا جا رہا تھا۔

’دادی اماں آپ نے میرا سب سامان رکھ دیا۔ ڈائری بھی رکھیے گا۔ میں روز لکھوں گا اور واپس آ کر آپ کو سناؤں گا۔ نعیم لاڈ بھرے لہجے میں بولا شاید وہ دادی کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’ہاں ڈائری بھی رکھ دی۔‘ دادی نے اپنی بھیگی پلکیں پوتے سے چھپاتے ہوئے کہا۔

’دادی اماں آپ بھی ڈائری لکھیے گا۔ مجھے سنایئے گا۔ نعیم کو اچانک یاد آ گیا کہ اس کی دادی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، اکثر و بیشتر اس کی پڑھائی اور ہوم ورک میں مدد بھی کرتی تھیں۔ اسے فخر تھا کہ اس کی دادی دوسرے بچوں کی دادیوں کی طرح نہیں ہیں۔

اگلی صبح سب ایک ساتھ ہی روانہ ہوئے۔ گاڑی انجان راستوں سے گزرتی ہوئی ایک ہوسٹل نما عمارت کے سامنے رکی۔ دادی کے ساتھ وہ بھی کود کر کار سے باہر آ گیا۔ ’دادی اماں، یہاں رہیں گی؟ نعیم نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

’ہاں بھئی۔ یہاں بہت سی لیڈیز رہتی ہیں۔ سب کے کمرے الگ الگ ہیں۔ نوکر ہیں، گارڈن ہیں، ٹی وی، وی سی آر کے علاوہ چھوٹا

”رات میں وہ سونے کے لیے لیٹا تو سرک کر دادی کے قریب پہنچ گیا اور ہمیشہ کی طرح دن بھر کی روداد دادی کو سنا دی۔ لیکن آج دادی کچھ بھی جواب دیے بغیر خاموشی سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی رہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دادی اماں ابو کو حکم دے دیں تب بھی کیا ابو نہیں مانیں گے۔ کیوں نہیں مانیں گے بالکل مانیں گے مجھ سے تو وہ روز کہتے ہیں ماں کا کہنا مانا کرو اور ممی دن بھر مجھے آرڈر دیا کرتی ہیں۔ پھر دادی ابو کو آرڈر کیوں نہیں دیتیں؟ اپنے باپ سے باتیں کرتا ہوا وہ دادی کی خاموشی سے الجھنے لگا اور نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا“

موٹا زو بھی ہے۔ اس کے پاپا شاید در پردہ اپنی ماں کو دلاسہ دے رہے تھے۔

دادی کا کمرہ اسے بھی پسند آیا۔ کھڑکی سے پھولوں کی کیاریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اگر امریکہ دیکھنے کا اس کو شوق نہ ہوتا تو شاید وہ بھی یہیں رہ جاتا۔ دادی کے پاس۔ ابو نے دادی کے لیے گھر تو بہت اچھا چنا ہے۔ وہ یہاں آرام سے رہیں گی۔ ابو کے انتظام سے نعیم مطمئن ہو گیا۔

لیکن یہ کیا— ؟ دادی اماں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اس نے انھیں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر یا تو ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی تھی یا خاموش سنجیدگی۔ اتنا اچھا انتظام ابو نے کیا ہے پھر بھی دادی خوش نہیں۔ اس نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا گویا ان تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آگے بڑھ کے دادی کو اپنی باہوں میں بھر لیا اور مزاحیہ انداز میں بولا ’اچھا...... اس نے اچھا کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

’یہ بتایئے آپ میرے لیے رو رہی ہیں یا ابو کے لیے۔‘ ؟

جواب میں سسکیاں اور تیز ہو گئیں تو اس نے دادی کے گرد اپنی باہوں کی

''امریکہ پہنچ کر بھی وہ دادی کے محبت بھرے لمس اور شفقت آمیز رویوں کو فراموش نہ کر سکا۔ ایک بیڈ روم سیٹ میں اسے انیکسی میں پڑے اس بیڈ پر سونا پڑتا تھا جو دن میں پھر صوفہ میں بدل جاتا تھا۔ انڈین ایمبیسی اسکول میں اسے ہندوستانی ساتھی بھی مل گئے۔ انتہائی ٹھنڈی آب و ہوا، چھوٹا سا مکان، برف باری، اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا رواج۔ ایک ایک کر کے ساری وجوہات اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں جن کی وجہ سے ابو دادی کو ساتھ نہیں لا سکے۔ دادی اور ان کی یاد سے وہ کبھی غافل نہ ہوا۔ پابندی کے ساتھ ڈائری لکھتا رہا اور جب بھی فون پر دادی سے بات ہوتی وہ انہیں ڈائری لکھنے کی تاکید ضرور کرتا''

گرفت سخت کرتے ہوئے ان کے آنسو پونچھے اور انھیں کے انداز میں انھیں کے لفظوں سے ان کو تسلیاں دینے لگا' اچھی دادیاں رویا نہیں کرتیں۔' انداز بالکل وہی دادی والا جو وہ روتے ہوئے نعیم کو چپ کرانے کے لیے اپناتی تھیں۔' اچھے بچے رویا نہیں کرتے' رونا بزدلی کی نشانی ہے۔ اپنی اس غلطی کو سدھارو جس کی وجہ سے تمھیں آج سزا ملی اور تمھیں رونا پڑا۔ اسی کو بہادری کہتے ہیں۔ بہادر بنو، بزدل نہیں۔!'

نعیم کے ان الفاظ نے جیسے جادو کر دیا ہو۔ دادی کی سسکیاں اچانک یہیں رک گئیں۔ کچھ بولے بغیر انھوں نے نعیم کی کمر تھپتھپا دی۔ جیسے اس کی نصیحت پر اسے شاباشی دے رہی ہوں۔

امریکہ پہنچ کر بھی وہ دادی کے محبت بھرے لمس اور شفقت آمیز رویوں کو فراموش نہ کر سکا۔ ایک بیڈ روم سیٹ میں اسے انیکسی میں پڑے اس بیڈ پر سونا پڑتا تھا جو دن میں پھر صوفہ میں بدل جاتا تھا۔ انڈین ایمبیسی اسکول میں اسے ہندوستانی ساتھی بھی مل گئے۔ انتہائی ٹھنڈی آب و ہوا، چھوٹا سا مکان، برف باری، اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا رواج۔ ایک ایک کر کے ساری وجوہات اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں جن کی وجہ سے ابو دادی کو ساتھ نہیں لا سکے۔ دادی اور ان کی یاد سے وہ کبھی غافل نہ ہوا۔ پابندی کے ساتھ ڈائری لکھتا رہا اور جب بھی فون پر دادی سے بات ہوتی وہ انھیں ڈائری لکھنے کی تاکید ضرور کرتا۔

انسان وقت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر لیتا ہے تاکہ اس کا شمار آسانی سے ہو سکے ورنہ وقت کو صرف اپنی رفتار سے غرض ہے۔ دو سال جیسے پنکھ لگا کر اڑ گئے۔ اس عرصے میں وہ پورے پانچ فٹ اور دس انچ کا ہو گیا۔ گویا قد میں اپنے ابو سے ایک انچ زیادہ۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ قد کے ساتھ ساتھ اس کی عقل بھی بلند اور سمجھ بھی کچھ اونچی ہو گئی۔ اچھا، برا، صحیح اور غلط کو سمجھنے کی تمیز آ گئی تھی۔ امریکن تہذیب کی اس نے برائیاں ہی سنی تھیں، لیکن بہت سی باتیں نعیم کو پسند آئی تھیں۔ اسے یہ بات بہت پسند تھی کہ اس ملک میں بچوں کو نا سمجھ نہیں کہا جاتا تھا اور نہ ہی انھیں بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ سارے بچے خود مختار اور آزاد تھے۔ وہ اپنے فیصلے خود کرتے تھے۔ اپنے میدان عمل خود چنتے تھے۔ وہ حیران بھی تھا کہ یہاں کے بچے اپنے والدین سے الگ اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں اور خوش بھی رہتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی کہ یہ ہنر ہندوستانی بچوں بلکہ بڑوں اور بزرگوں کو بھی سیکھنا چاہیے جن کے سارے غم، ساری خوشیاں دوسروں کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ اکیلے نہ وہ خوش ہوتے ہیں نہ غمگین بلکہ غم ہو یا خوشی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مناتے ہیں۔ نعیم حالانکہ اپنی تمام خوشیاں اور غم چھوٹی چھوٹی واردات، ڈائری میں جمع کر کے دادی کے ساتھ شیئر کرنے کو بیتاب تھا۔ واپسی کا سفر نعیم کے لیے بہت خوشگوار تھا۔ جیسے جیسے ہندوستان قریب آ رہا تھا اس کے اندر ایک اپنے پن اور اعتماد کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ ہوائی جہاز جب دلی ایئر پورٹ پر رکا تو رات ہو چکی تھی لہٰذا وہ لوگ سیدھے اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن وہ رات اس کے لیے بڑی لمبی ہو گئی تھی جس کی صبح اسے دادی اماں کو لینے جانا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اسی گھر میں دو سال قبل وہ دادی کی مدد کے بغیر اسکول کے لیے بھی تیار نہیں ہو پاتا تھا لیکن آج صبح جلدی اٹھا اور تیار بھی ہو گیا۔ اس عرصے میں اپنے خود کے کام اور خود کے فیصلے کرنا سیکھ لیا تھا۔' میں بھی جاؤں گا دادی جان کو لینے' اتنا کہہ کر وہ کار کی طرف بڑھ گیا۔

'ٹھہرو، بھئی میں اماں کو فون کر دوں کہ وہ تیار رہیں میں انھیں لینے آ رہا ہوں۔' نمبر تو فوراً مل گیا۔ ادھر سے جواب کیا آیا نعیم نہیں سن

سکا لیکن پاپا کے چہرے کی ناگواری اور ماتھے کی شکنوں سے اسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے' کیا ہوا پاپا-؟'

' کچھ نہیں— کچھ نہیں— آؤ چلتے ہیں'۔

اور پھر نعیم کو وہی راستہ بہت طویل محسوس ہوا جسے طے کرنے میں صرف بیس منٹ لگے۔ اس نے اولڈ ہاؤس کو دور ہی سے پہچان لیا۔ کار پوری طرح رکنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ کود کر باہر آ گیا اور سیدھا دادی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہر چیز اپنی جگہ سیٹ اور درست مگر کمرہ خالی۔ اس نے باہر نکل کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔' ارے! اوہو۔اوہو'۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ چھوٹے چھوٹے آٹھ دس بچوں کے سامنے ایک کرسی پر دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور شاید بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ دادی کو آج تو کمرے میں ہونا چاہیے تھا وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ نعیم برآمدے سے اتر کر لان نما گھاس کے میدان میں آ گیا۔ دادی پوتے کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائیں لیکن نعیم کو لگا کہ اسے دیکھ کر دادی بہت خوش نہیں ہوئیں حالانکہ وہ خود بہت ایکسائٹڈ تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ دادی نے کتاب بند کی اور پھر بچوں کی ملی جلی آوازیں' دادی جی ٹاٹا۔ دادی جی بائے بائے۔ دادی اس کی طرف بڑھیں تو وہ دوڑ کر دادی سے لپٹ گیا۔ دادی نے بھی پیار سے اسے گلے لگا لیا۔ بڑی دیر تک اس کی کمر تھپتھپاتی رہیں اور کمرے کی طرف بڑھ گئیں بیٹے نے ماں کے سامنے سر جھکایا۔ ماں نے پیشانی پر بوسہ دے کر دعائیں دیں لیکن کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔

' اماں آپ تیار نہیں—؟ آپ نے سامان واماں نہیں سمیٹا؟'

ماں نے بھرپور نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر نرم لہجے میں بولیں۔' سمیٹوں......؟ پھر بکھرنے کے لیے......؟'

' جی......؟' بیٹے نے اتنی حیرانگی کے ساتھ جی کہا جیسے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ لیکن ماں تو جیسے ہر سوال کا دوٹوک جواب سوچے بیٹھی تھی۔' میں کہہ رہی ہوں کہ میں سامان سمیٹ لوں پھر سے بکھرنے کے لیے......؟ کل تمھیں اگر پھر جانا پڑا تو......؟ اب تو تمھارا آنا جانا لگا ہی رہے گا۔'

' ارے اماں تب کی تب دیکھیں گے۔ آپ ابھی سے کیوں پریشان ہیں؟' ' میں ابھی تو پریشان نہیں۔ بالکل نہیں۔ جب یہاں آئی تھی تب میں بہت پریشان تھی۔ میرا وجود جیسے کئی ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔ کچھ حصہ تمھارے ساتھ تھا۔ کچھ نعیم کے ساتھ اور کچھ اس کے کمرے میں چھوٹ گیا تھا جس میں میں پچھلے پندرہ برسوں سے رہ رہی تھی۔ یہاں اس کمرے میں آدھی ادھوری پہنچی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنی ذات کے ٹکڑوں کو یکجا کیا۔ بڑی دشواریوں کے ساتھ! اور اب اس اولڈ ہاؤس میں میں بکھری ہوں لیکن اپنے مکمل وجود کے ساتھ!'

' اماں......اماں...... میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں آپ کی بات۔ آپ ہماری ہو کر یہاں رہیں گی۔ کیسے......اور کیوں......اور کب تک'؟

' تمھاری نہیں...... اپنی ہو کر......!' ماں کے لہجے کی نرمی ابھی تک برقرار تھی' دادی جان آپ یہاں کیا کریں گی۔ اکیلے کیسے رہیں گی۔'؟

' آپ کو کیا ہو گیا ہے'۔ نعیم نے باپ کی تائید کی۔

' کیا کروں گی......؟ ارے میں کر رہی ہوں تم نے ابھی دیکھا۔ ملازموں کے بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ یہاں داخل جوان بے سہارا لڑکیوں کو سلائی بنائی سکھاتی ہوں اور بیچاری بزرگ عورتوں کو کہانیاں وغیرہ سنا دیتی ہوں۔ بس!

چند لمحہ ٹھہر کر وہ بیٹے سے مخاطب ہوئیں' میں اپنے آپ کو جی رہی ہوں۔ اپنے وجود کو اپنی ضرورت کو محسوس کر رہی ہوں۔ بار بار بکھرنا اور سمٹنا، اجڑنا اور بسنا میں اب برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ وہاں تمھارے گھر میں اب میری کیا ضرورت ہے'؟ مگر بیٹا ماں کی بات ان سنی کر کے ٹہلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور محاذ پوتے نے سنبھال لیا۔

' دادی جان آپ سوچئے تو۔ آپ کیوں ایسے Behave کر رہی ہیں پاپا کتنا ہرٹ ہوئے ہیں آپ انھیں ہرٹ کر رہی ہیں'۔

' کون Hurt ہوا ہے۔ یہ بات پھر کبھی۔ لیکن آج میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں چل رہی'۔

' میں اب ناسمجھ نہیں ہوں۔ آپ کی بات غلط ہے۔ آپ ہماری کوئی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں۔ نہ میری مانتی ہیں نا پاپا کی۔ یہ تو آپ کی دادا گیری ہے'۔

' تم اب بھی ناسمجھ ہو۔ مگر اب مرد ہو اور غلط بول رہے ہو۔ یہ دادا گیری نہیں......دادی گیری ہے'۔

□□□

Salma Hijab
3/32 Vipul Khand
Gomti Nagar
Lucknow-226010 (U.P)

اگنی پریکشا

شاہدہ شاہین

جب سے جانکی کو پتہ چلا تھا کہ اس کے پیر بھاری ہیں اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور راگھو کے تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ پچھلے مہینے ان کی شادی ہوئی تھی۔ شادی والی رات ہی راگھو نے پتنی سے کہہ دیا تھا کہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی اسے پاپا کہہ کر پکارنے والا کوئی جلد ہی چاہیے۔ اتفاقاً جانکی کو بھی بچوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اوپر والے نے جب نوید سنائی تو دونوں مارے خوشی کے کھل اٹھے۔ آنے والے مہمان کے خیر مقدم کا اس طرح اہتمام کرنے لگے جیسے سرکاری دفتر میں کسی وزیر کی متوقع آمد میں کیا جاتا ہے۔

آفس میں کام کے دوران بھی راگھو کو یہی فکر لگی رہتی کہ جانکی نے ٹھیک وقت پر کھانا کھایا ہوگا کہ نہیں۔ کہیں مصروفیت میں دوائی لینا بھول نا گئی ہو!'' ذرا فرصت ملتے ہی فون کرکے تسلی کر لیتا اور لگے ہاتھوں ڈھیر ساری ہدایات بھی صادر فرما دیتا۔

شام کو ہوا خوری کے بہانے وہ کسی نزدیکی مال کی طرف نکل جاتے اور آنے والے مہمان کے لیے کوئی نہ کوئی نئی شے ضرور خرید کر لے آتے۔ عورت کے ماں بننے کے دوران برتی جانے والی احتیاط پر مبنی جتنے رسالے دستیاب تھے راگھو نے سب کے سب خرید ڈالے اور پہلی فرصت میں پڑھ لیے۔ جانکی بھی اس کا ایک ایک لفظ پڑھ چکی۔

آفس سے باقاعدہ چھٹی لے کر جانکی کو ماہانہ جانچ کے لیے لے جانا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر کے ذریعے دی گئی ایک ایک فہمائش بھی اسے ازبر ہو جاتی۔ جانکی کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک وہ ان پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا نہ ہو جاتی۔ پتی کے والہانہ انداز کو ملاحظہ کر کے جانکی نہال ہو جاتی اور سینہ فخر سے پھول جاتا کہ ساری دنیا میں اپنی بیوی سے سب سے زیادہ پیار کرنے والا پتی صرف اس کا ہے۔ لیکن یہ شدید جنون کبھی کبھی غیر معمولی سا محسوس ہوتا۔

راگھو کا پیار فوری ارتکاز توجہ کا حامل ہوا کرتا تھا۔ ویسے بھی اس نے اپنے پتا اور بھیا کے علاوہ کسی اور مرد کو اتنے قریب سے بھلا دیکھا ہی کب تھا لیکن ان دونوں کی بات ذرا الگ تھی۔ وہ شفقت اور پیار دلار یاد کر کے اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ دوران حمل عورت بہت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے اور یہ تو جانکی کا پہلا حمل تھا۔

ڈاکٹر کے ذریعے طے کیے گئے حساب کے مطابق مدت پوری ہونے میں ابھی دس دن باقی تھے۔ اس کے بعد کسی دن بھی متوقع گھڑی آسکتی تھی جس سے ان کی دنیا ہی بدل جانی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ڈاکٹر نے اس دوران ذرا سے آثار دکھائی دیتے ہی فوراً چلے آنے کی تاکید کی تھی۔

آج راگھو کی چھٹی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ دونوں رات دیر گئے تک اپنے گھر کے سامنے والے برآمدے میں بیٹھے رہتے جس کے آنگن میں جانکی نے اپنے ہاتھوں سے ایک چھوٹی موٹی پھلواری لگا رکھی تھی۔ نازک سے پودوں پر لاتعداد رنگین و خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے جن کی مدہوش کن مہک فضا میں پھیل جاتی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ دونوں اپنی تشکیل کردہ چھوٹی سی خوبصورت دنیا میں کھوئے رہتے۔ ان کا گھر آنگن پھولوں سے مہک رہا تھا اب زندگی میں پھول کھلنے کا انتظار تھا۔ راگھو کہتا۔

''ایسا لگتا ہے مانو ہمارا بچپن پھر سے آنے کو ہے''

خوابیدہ آنکھیں لیے وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر کہتی

”آفس سے باقاعدہ چھٹی لے کر جانکی کو ماہانہ جانچ کے لیے لے جاناوہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر کے ذریعے دی گئی ایک ایک فہمائش بھی اسے ازبر ہو جاتی ۔جانکی کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک وہ ان پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا نہ ہوجاتی۔ پتی کے والہانہ انداز کو ملاحظہ کر کے جانکی نہال ہو جاتی اور سینہ فخر سے پھول جاتاکہ ساری دنیا میں‌اپنی بیوی سے سب زیادہ پیار کرنے والا پتی صرف اس کا ہے ۔لیکن یہ شدید جنون کبھی کبھی غیر معمولی سا محسوس ہوتا“

”جب ہم دونوں کے بیچ کوئی آجائے گا تب ہمارا بندھن اور بھی مضبوط ہو جائے گا“

”ہم دونوں نے مل جل کر جو سپنا دیکھا ہے اس کی خوبصورت تعبیر جلد ہی سامنے آئے گی“ پرامید آنکھوں سے خلاء میں دیکھتا ہوا وہ کہتا۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر رہا ہوگا، دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں مستقبل کے سنہرے سپنوں میں کھوئے نیند کی خوبصورت وادیوں کی سیر کر رہے تھے کہ اچانک جانکی کی آنکھ کھل گئی۔اس نے آہستگی سے راگھو کی بانہیں اپنے اوپر سے ہٹائیں اور با احتیاط مسہری سے نیچے اتر آئی۔اسے کمر میں ہلکا سا درد محسوس ہو رہا تھا اور گلا بھی سوکھ رہا تھا۔اس نے فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگا لی اور پھر اچانک ٹائلٹ کی طرف دوڑ گئی۔باہر آنے کے بعد گھبرا کر راگھو کو آواز دی کیونکہ اس کی بے چینی و بے آرامی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

راگھو ہڑبڑا کر نیند سے جاگا اور جانکی کا بستر خالی دیکھ کمرے سے باہر آگیا۔ جانکی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور شدید درد کے مارے اپنا پیٹ پکڑ کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ ایک ناقابلِ برداشت تکلیف سے گزر رہی ہے جسے بیان کرنے کی سکت اس میں نہیں ہے۔

اس نئی افتاد پر راگھو پریشان ہو اٹھا......اوپر والے کی دیا سے اب تک تو سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر آخری دنوں میں یہ کون سی مصیبت کھڑی ہوگئی!اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی دی ہوئی نصیحت گونج گئی....

”اگر کوئی غیر معمولی صورتحال پیش آئے تو اسپتال آنے میں دیر مت کرنا۔“

اس نے لپک کر جانکی کو بانہوں میں اٹھا لیا اور آناً فاناً باہر لا کر اپنی دو پہیہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ باہر رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جانکی بمشکل آواز دبا کر کراہ رہی تھی۔ گھر کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے راگھو نے اسے تسلی دی اور دونوں بازو اپنی کمر کے گرد حائل کر کے مضبوط پکڑے رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے گاڑی پوری رفتار سے دوڑا دی۔

ہسپتال ان کے گھر سے بس تھوڑی دوری پر واقع تھا۔ مستعد چوکیدار نے ان دونوں کو دیکھتے ہی فوراً اندر خبر کردی۔ وارڈ بوائے اسٹریچر لے کر دوڑتے ہوئے باہر آگئے اور جانکی کو بہ احتیاط لیٹا کر اندر لے گئے۔

ہسپتال کے وسیع و عریض کوریڈور میں لمبے ڈگ بھرتے ہوئے راگھو کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ اگلے چند لمحوں میں نہ جانے کس نوعیت کی خبر سننے کو ملے گی۔ مارے اذیت کے جانکی کا سفید چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے تصور میں بار بار اُبھر آتیں۔ بدقسمتی سے نہ جانکی کے ماں باپ اس دنیا میں تھے اور نہ اس کی اپنی ماں حیات تھیں جو انہیں ٹھیک صورتِ حال سے آگاہ کرتے۔

ایک نرس آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی ۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ دریافت کر پاتا عجلت میں دوڑتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ متواتر ایک کے پیچھے ایک ڈاکٹر نرسیں متذبذب چہرے لیے آتے جاتے رہے اور وہ حیران پریشان نہ جانے کتنا عرصہ وہیں کھڑا رہا۔ اتفاقاً اس کی نظریں اوپر آسمان پر پڑیں۔ سحر نمودار ہو رہی تھی۔ ایک نئی صبح ہونے کو تھی۔ اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ اندر سے کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک نرس بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔

”مبارک ہو، آپ کی پتنی کو لڑکا ہوا ہے........بچہ کمزور پیدا ہوا ہے لہٰذا اسے کچھ عرصہ انکیوبیٹر کے اندر رکھنا ہوگا“

پھر وہ بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔اس نے بچے کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔ دراصل یہ غیر متوقع خبر سن کر وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔اس کے دل میں لایعنی وہم وگمان کے جھکڑ چل پڑے تھے۔ڈاکٹر کے قیاس کے مطابق تو بچہ کی پیدائش میں کم سے کم دس دن باقی تھے!

ایک ڈاکٹر عجلت میں لیبر وارڈ سے باہر نکلا اور اسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا کہ وہ اپنی پتنی سے مل سکتا ہے۔ راگھو خالی خالی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔

جانکی کا ستا ہوا چہرہ مارے خوشی کے دمک رہا تھا وہ سرتا پا ایک

انوکھے سرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔اس کے برعکس راگھو ایک ناقابل بیان ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کھل کر مسکرا بھی نہ سکا۔جانکی نے فتح مندانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کے متردد عمل کو محسوس کرکے اپنے بارے میں اس کی ازلی فکر پر محمول کرکے ہولے سے مسکرادی۔

باوجود تمام ثبوت وشواہد کے بچے کی ولادت کی خبر سنتے ہی راگھو کی دنیا تہ و بالا ہو چکی تھی۔دراصل اس کے اپنے دوستوں اور ہم عصر ساتھیوں نے شادی کو ایک سال گزر جانے کے بعد باپ بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔اب وہ سب کے سامنے کس منہ سے کہے کہ اپنی شادی کو ابھی نو مہینے مکمل نہیں ہوئے کہ گھر میں ایک عدد بچہ آموجود ہوا ہے۔نہ جانے کیا کیا بہتان اٹھ کھڑے ہو جائیں گے!

پتا نہیں کیسے پڑوسیوں کو جانکی کے ماں بننے کی سن گن مل گئی،سب کے سب مبارکباد کے ساتھ ساتھ اپنی خدمات بھی پیش کرنے آپہنچے تھے حتیٰ کہ اس کے دفتر میں بھی خبر پہنچ گئی۔درخواست پیش ہونے سے پہلے ہی باس نے اس کے لیے پندرہ دن کی چھٹی مختص کردی تھی۔اسے پہلی بار احساس ہوا کہ ایک نوزائیدہ کی آمد کتنی مبارک اور خوش کن ثابت ہوتی ہے۔اپنے پرائے سب کے سب شاداں ہو رہے تھے لیکن کیا فائدہ جب سب کو اصلیت کا پتا چلے گا تو پشیمانی کا سامنا کرنا پڑے گا یہ سوچ کر اس کا دل دہل اٹھا۔

زچہ بچہ خیریت کے ساتھ گھر آگئے۔جانکی اپنے نونہال کی پرورش و پرداخت میں گویا دنیا بھلائے بیٹھی تھی۔ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے اس حقیقت سے قطعی بے خبر رہی کہ اس کے شوہر کے دل و دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے اور آنے والا وقت اس کے لیے اپنے دامن میں کون سا طوفان پوشیدہ کیے ہوئے ہے۔دن ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔

آخر کار وہ طوفان دبے پاؤں چل کر ایک دن اچانک سامنے آکھڑا ہوا۔

راگھو کسی کام کے بہانے دو دن کے لیے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔

اچانک ڈاکیہ اس کے نام کی ایک رجسٹری دے گیا۔وہ متعجب رہ گئی۔لفافہ کھول کر اس کے اندر رکھے ہوئے خط کو پڑھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔بغیر کسی وضاحت کے دو دن بعد اسے عدالت میں حاضر ہونے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ادھر راگھو کا فون مسلسل سوئچ آف آرہا تھا۔مارے تشویش کے وہ رات بھر سو نہیں پائی۔اگلی صبح بھی نہ راگھو آیا اور نہ فون پر اس سے رابطہ قائم ہوسکا۔

یک بیک کال بیل بج اٹھی۔راگھو کی آمد کی توقع میں اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو سامنے راگھو کے دوست سلیم کو کھڑا پایا۔سلیم نے جانکی کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کو ملاحظہ کرتے ہوئے جانکی ایک طرف ہٹ گئی اور میز پر پڑا ہوا لفافہ اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

''بھیا ذرا دیکھیے تو سہی یہ ہے کیا! میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ ادھر آپ کے دوست بھی بنا اطلاع کیے کہیں چلے گئے ہیں!''

''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو اس صورتحال کو بالتفصیل بیان کرسکیں۔ادھر راگھو کا بھی دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے''،سلیم نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اچھا! آپ راگھو سے رابطے میں ہیں! تو صاف صاف بتایئے نا! بات کو گھما پھرا کر میری پریشانی مت بڑھایئے'' جانکی نے روہانسی ہو کر التجا کی۔

۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں......آپ کے منے کی پیدائش والے دن سے راگھو ایک بھاری کشمکش میں گرفتار ہے۔اس نے کئی بار کوشش کی لیکن آپ کے سامنے ظاہر کرنے کی ہمت نہیں جٹا سکا۔ویسے میں نے بارہا اسے سمجھانے کی کوشش کی جو مسلسل رائیگاں گئی۔اس مسئلے پر کئی ایک ماہرین سے مشورہ کرکے تصدیق بھی کی گئی لیکن اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ایک پھانس سی ہے جو بے چارے کے دل میں چبھ گئی ہے اگر وہ نکل جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''

اس کے خاموش ہوتے ہی جانکی نے فوراً کہا۔

''اب کہہ بھی دیجیے......آپ جس حقیقت کو کھل کر بیان کرنے سے کترا رہے ہیں وہ میرے اپنے پتی میرے معصوم بچے کے باپ کے دل میں ایک مدت سے جاگزیں رہی ہے۔''

سلیم نے ایک سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو جانکی نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی اور سر گھومنے لگا۔ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ سلیم نے لپک کر اپنے ہاتھوں پر تھام لیا اور انتہائی ادب واحترام کے ساتھ کوچ پر لٹا دیا۔

شک کی چنگاری جب سلگتی ہے تو اسے شعلہ بنتے دیر نہیں لگتی۔راگھو جانکی کی وفاداری پر اس لیے مشکوک تھا کہ یہ بچہ ان کی شادی کو نو مہینے پورے ہونے سے قبل ہی دنیا میں آگیا تھا۔اس بے بنیاد شک کو دور کرنے کی وضاحت طلب کرتے ہوئے نہ صرف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا بلکہ بچے کے باقاعدہ DNA TEST کا بھی تقاضا کیا گیا تھا۔

وہ جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لفافے کو گھورنے لگی۔سلیم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

'' سامنے والے کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر آدمی کی سوچ اس کی اپنی نفسیات پر مبنی ہوتی ہے۔ ویسے آپ کے مقابلے میں راگھو بے حد جذباتی اور جلد باز ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ کم از کم آپ تو دور اندیشی سے کام لیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس نوعیت کے شک وشبہات کا فیصلہ پل بھر میں ہوسکتا ہے۔ بس ایک معمولی سی جانچ ہے۔ ہو جانے دیجیے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔ اس طرح اس نادان کا تردد بھی دور ہوجائے گا اور آپ کی زندگی پھر پہلے جیسی ہوجائے گی۔''

جانکی زخم خوردہ نگاہوں سے اس کا چہرا تکنے لگی۔ گرمی نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

''میں یقین دلاتا ہوں کہ اسے آپ پر پورا بھروسہ ہے لیکن جب معاملہ اولاد کا ٹھہرا اور وہ بھی لڑکا، تو بے چارہ اپنی تسلی کر لینا چاہتا ہے کہ کل کو پچھتانا نہ پڑ جائے۔ آپ دونوں کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ جس طرح وہ چاہتا ہے پس اسی طرح اس شاخسانہ کا خلاصہ ہوجائے۔''

جانکی نے متحیر ہو کر کہا:

''میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آخر عدالت کا دروازہ کیوں کھٹکھٹایا گیا ہے۔ اس بات کی تصدیق نجی طور پر بھی تو کی جاسکتی تھی، سرِ عام کہنے کی کیا ضرورت آن پڑی!''

سلیم نے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''اب آپ سے کیا چھپانا بھابھی۔ راگھو کا خیال ہے کہ اگر DNA TEST کا مثبت نتیجہ نکلا تو حقیقت روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں ہوجائے گی اور لوگ باتیں بنانا چھوڑ دیں گے۔ اگر نتیجہ منفی رہا تو عدالت کی رو سے علاحدگی اختیار کرنے کی اجازت بہ آسانی مل جائے گی۔''

جانکی کے حسین خوابوں کا محل پل بھر میں زمین بوس ہوگیا۔ وہ گنگ رہ گئی۔ جس عقیدت کے ساتھ اپنا سب کچھ تفویض کر دیا تھا اس کا پیار لگاوٹ وہ شدید محبت ...... سب کچھ اس قدر بودا نکلا کہ کسی فرضی طوفان کے آگے ایک ریت کے گھروندے کی مانند مسمار ہوگیا! اس کے لایعنی جنون کی شدت یہاں تک پہنچ گئی کہ کئی ایک خیر خواہ اور ماہرین کی حمایت بھی فضول ثابت ہوئی تھی۔

صدیوں سے ثابت ہوتا آیا ہے کہ عورت کے پاس اپنی وفاداری اور پاک دامنی کا یک بارگی ثبوت دینے کے واسطے کچھ نہیں ہوتا۔ ازدواجی رشتہ صرف اعتماد کے بل پر اُستوار ہوتا ہے........ وہ رشتہ ہی کیا جس کی بنیاد دنیا والوں کے کہنے سننے کے خوف سے یا ایک مہمل سی بدگمانی سے ڈگمگا جائے۔ حقیقتاً ازدواجی رشتے کا انجام خوش گوار مقصود ہے تو صبر و تحمل، اعتماد اور برداشت جیسے شفاف اوصاف لازمی ہوجاتے ہیں۔

راگھو کے دل و دماغ میں شک کی جڑیں اتنی مضبوط ہوچکی تھیں کہ اسے یہ بھی احساس نہیں رہا کہ جانکی کے ساتھ ایک عرصہ زندگی گزارنے اور اس قدر قریب سے دیکھ پرکھنے کے باوجود اس کے شفاف کردار پر انگلی اٹھانا گویا اپنے آپ پر شک کرنے کے مترادف ہے۔

ادھر جانکی خود کو اس قدر بے بس، حقیر و لعنتی محسوس کر رہی تھی جس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا......... وہ سچ مچ پیار تھا یا خود غرضی جو صرف اولاد کے حصول پر مبنی تھا...... اگر ایک اس کے شوہر کو اس کی وفاشعاری پر یقین ہوتا تو وہ بڑے سے بڑے طوفان کے آگے سینہ سپر ہوجاتی لیکن یہاں تو خود اس کی اپنی زندگی کے ناخدا، اس کی ناموس و وقار کے رکھوالے کو اس پر بھروسا نہیں رہا۔ اب اگر ساری کائنات بھی اس پر اعتماد کرلے تو کوئی فائدہ نہیں۔

بدقسمتی سے ہر دور میں عورت کا مقام سدا غیر محفوظ رہا ہے۔ اسے ہر بار اپنی معصومیت و پارسائی ثابت کرنے کے لیے متعدد نوعیت کی اگنی پریکشاؤں سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورت نے اپنی بے گناہی ثابت ہوجانے کے بعد اسے خوامخواہ کٹہرے میں لا کھڑا کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کیا ہے۔

عدالت کے حکم کے مطابق وہ بچے کو لے کر ہسپتال پہنچ گئی۔ راگھو بھی وہیں موجود تھا اور نظریں نیچی کیے لاتعلق سا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بیگانہ انداز کو ملاحظہ کرکے جانکی کو دنگ رہ جانا پڑا۔ اندر سے بچے اور اس کے باپ کا نام پکارا گیا تو راگھو اٹھ کر اندر جانے لگا۔ جانکی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا پھر براہ راست آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''جانچ تو ہوتی رہے گی...... اس کا نتیجہ آنے سے پہلے میرا فیصلہ سنتے جاؤ..... مقدس اگنی کو ساکشی مان کر سات پھیرے لینے کے بعد اتنا عرصہ میرے ساتھ گزارنے کے باوجود جس انسان کو میری وفاداری اور پاک دامنی پر شک ہے ایسے انسان کی رفاقت مجھے...... اس جنم میں تو کیا اگلے کسی جنم میں بھی منظور نہیں۔''

□□□

Shahida Shaheen
371, 6th Cross,
Opp. Nehru Park, Udayagiri
Mysuru-570019 (Karnataka)

محمد حنیف خان

فیصلے کا حق

"تعلق وہی اچھے جنھیں توڑا جا سکے" یہ کہتے ہوئے اس نے ہونٹ سکوڑے بھنویں تانی اور خیالوں میں گم ہوگئی اور میں اس کے اس جملے کی سختی کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں نے سکوت کی چادر کو سمیٹتے ہوئے اس سے کہا لیکن آپ کا یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میری آواز سن کر وہ چونکتے ہوئی بولی اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے؟

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کے اس سوال کے بعد میری نظریں زمین پر گڑ گئیں اور پھر میں سوچنے لگا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اسے جواب کیا دوں، اور وہ میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھے جارہی تھی۔

اس نے کھنکھارتے ہوئے متبسم انداز میں مجھ سے پوچھا۔

کیوں آپ نے جواب نہیں دیا، اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے؟

میں نے اب کی بار بغیر کچھ سوچے ہوئے منہ کھول دیا۔ میں نے کہا بات دراصل یہ ہے کہ جب توڑنا ہی ہو تو تعلق جوڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

میرے اس جملے پر وہ زور سے ہنسی اور بولی، دنیا تمھاری طرح پاگل تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کاروبار دنیا چلتا ہی نہیں اور آج کے دور میں تو اس کی کوئی صورت ہی نہیں۔

وہ بولے جارہی تھی اور میں خاموش سب سن رہا تھا۔

اس درمیان اس نے ایک سوال میری طرف اچھالا۔

تعلق سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

سوال تو بڑا آسان تھا مگر جواب بڑا مشکل۔ میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ کچھ سوچ کر پھر رک گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا بولیے بولیے میں جاننا چاہتی ہوں کہ تعلق سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

میں نے کہا تعلق تو ایک نادیدہ شے ہے، کسی سے خود کو جوڑ کر رکھنا، اس کے دکھ درد اور خوشی کو اپنا سمجھنا۔ اچھے برے وقت میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے رہنا یہی سب اس کا مطلب ہے۔

لمبی چوڑی تقریر کر کے میں سوچ رہا تھا کہ میری ان باتوں سے وہ مرعوب ہوجائے گی اور اس کا جواب اس سے نہیں بن پڑے گا۔ مگر ایک جھٹکے میں اس نے میرے تصورات کے قلعے کو منہدم کر دیا۔

اس نے مجھے اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن کب تک؟

یہ سوال غیر متوقع تھا اس لیے ایک بار پھر میں سوچنے لگا مگر اس بار زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی اور میں نے جواب اس کی طرف اچھال دیا۔

جب تک ممکن ہو۔

یہ سنتے ہی اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی میں آپ سے ہی کہنا چاہتی تھی اور آپ نے کہہ بھی دیا۔

اس کے اس جملے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی اور میں نے کیا کہہ دیا، اس لیے میں نے ملتجی نگاہوں سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب؟

یہ سن کر اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ نے خود اپنے سوال کا جواب دے دیا۔ اب اس میں میرے لیے کچھ نہیں بچا جو میں بولوں۔ اس نے کہا جب تک ممکن ہو، تو بس میرے اس فلسفے کا یہی مطلب ہے۔

لیکن میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ آخری حد تک ساتھ نبھانا چاہیے۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران ایک نرس آگئی، اس نے اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے کہا۔

”وری گڈ آج تو بہت اچھی ہیں، دو دن میں بالکل نارمل ہو جائیں گی“۔ پھر اس نے تھرمامیٹر نکال کر اسے ہلایا اور اس کے دونوں ہونٹوں کے درمیان پھنساتے ہوئے کہا زبان اوپر اٹھا کر اسے نیچے دبا لیجیے۔

اس نے ایک مطیع بچی کی طرح تھرمامیٹر کو منہ میں دبا لیا اور تھوڑی دیر بعد اس نے نکال کر دیکھا تو کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں آج بخار بھی نہیں ہے۔

میں نے نرس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا سسٹر اور کچھ؟ اس نے کہا ”نو سر“ اور وہ چلی گئی۔

میں اسپتال میں بحیثیت ماہر نفسیات تعینات تھا۔ کافی عرصہ گزر گیا تھا میری تقرری کو، مگر یہ پہلا ایسا کیس تھا جو میرے سامنے آیا تھا جسے سلجھانے میں میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

یہاں میرا کام یہ تھا کہ جو لوگ اپنی مرضی سے موت چاہتے ہیں ان کی میں کونسلنگ کروں اور انھیں میں زندگی کی اہمیت سمجھاؤں، ان کو بتاؤں کہ زندگی کتنی اہم ہوتی ہے اور اگر یہ زندگی ختم ہوگئی تو دنیاوی زندگی کسی بھی طور دوبارہ نہیں ملے گی۔ بعض دفعہ میں ناکام بھی ہو جاتا کیونکہ یہاں وہی لوگ آتے ہیں جو زندگی سے گھبرا چکے ہوتے ہیں یا جن کا مرض ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ سماج میں رہنے کے لائق خود کو نہیں سمجھتے۔ ایسے میں ان کو سمجھانے کا مطلب بھی نہیں ہوتا اور یوں بھی یہ سینٹر اسی لیے قائم کیا گیا تھا تاکہ لوگ اپنی مرضی سے زندگی جی سکیں اور اپنی مرضی سے موت کو گلے لگا کر جب چاہیں اس کا خاتمہ کر سکیں۔

یہاں رجسٹریشن کے بعد ایک ہفتہ ایسے وارڈ میں رکھا جاتا جہاں مریضوں کو دوائیں دیے جانے سے زیادہ ان کی کونسلنگ کی جاتی تاکہ وہ اپنے فیصلے سے باز آجائیں حالانکہ یہ سینٹر کے لیے نقصان دہ تھا مگر کسی بھی پیشہ کے انسانی پہلو کے مدنظر یہاں کونسلنگ کو اہمیت حاصل تھی۔ ملک کا یہ اپنی طرح کا پہلا سینٹر تھا اس لیے سرکار نے بھی بڑی پابندیاں اور حدود و قیود لگا رکھے تھے جن کی رو سے بھی سینٹر ایک ہفتے تک ان مریضوں کی کونسلنگ کرتا تھا۔

جب سے یہ عورت یہاں آئی تھی سب کی توجہ کا مرکز وہی تھی کیونکہ دیکھنے میں خوبصورت اور وجیہ شکل تھی۔ اس عمر میں بھی خوبصورتی اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر وہ ایوتھینیز یا چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب میں نے اپنی زندگی اپنے مطابق گذاری ہے تو موت کو کیوں نہ اپنے مطابق گلے لگاؤں، جینے اور مرنے کا فیصلہ میرا حق ہے کیونکہ اس کا تعلق سیدھا میری ذات سے ہے۔

دیکھنے میں وہ کسی بھی طرح سے بیمار نہیں لگ رہی تھی مگر اس کی خواہش تھی کہ اسے ایوتھینیز یا دیا جائے۔ میں پہلے دن سے اسے سمجھا رہا تھا اور اس کی کونسلنگ کر رہا تھا۔ آج پانچواں دن تھا۔ اب میرے پاس صرف دو دن بچے تھے۔ اگر ان دو دنوں میں کامیاب نہ ہوئے تو اس کے پاس زندگی کے صرف دس دن بچیں گے۔

آج میں تہیہ کر کے آیا تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں ہر حال میں کامیاب ہونا ہے، اس لیے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ سب سے پہلے مجھے اس کی زندگی کے بارے میں معلوم کرنا ہے تاکہ اس کی روشنی میں اس کو راضی کر سکوں۔

اس نے جو اپنی کہانی سنائی وہ دلچسپ تو ضرور تھی مگر تھی بڑی خطرناک۔ میں کانوں سے اس کی کہانی سن رہا تھا مگر میری آنکھیں اس کی حرکات و سکنات پر تھیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں اور پتلیوں کا زیر و بم بھی مجھ سے چھپا نہیں تھا۔ جتنی تیز اس کی زبان چل رہی تھی اتنی ہی تیز اس کی پلکیں اور بھنویں ناچ رہی تھیں۔ میں بڑا حیرت زدہ تھا کہ بھلا کوئی ایسا شخص بھی یہاں آسکتا ہے۔ جس کے رگ رگ میں اس قدر زندگی دوڑ رہی ہو۔ مگر وہ آئی تھی اور اپنے فیصلے پر اٹل بھی تھی۔ جب وہ اپنی داستان حیات ختم کر چکی تو میں نے کہا لیکن آپ نے ایسا کیا کیوں؟

تو اس نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ ’تعلقات وہی اچھے جنھیں توڑا جا سکے۔“

اس کی زندگی اس ایک جملے میں سمٹ آئی تھی۔ آپ خواہ اس کی پوری کہانی سن لیں یا پھر بس ایک جملہ دونوں برابر ہیں مگر کہانی اس اجمال کی تفصیل ہے اس لیے اس میں دلچسپیاں کچھ زیادہ ہیں۔ تو آپ بھی سن لیجیے مگر میری نہیں ان ہی کی زبانی تاکہ درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

میں بچپن سے بہت تیز اور ضدی تھی۔ جس کا سودا میرے دماغ میں

سماجاتا تو پھر وہ نہیں ٹکتا اسی لیے گھر والے مجھے سنکی کہنے لگے تھے۔ بھائیوں سے میری خوب لڑائیاں ہوتی تھیں مگر دوسری بہنوں کی طرح نہیں کہ پٹ جائیں پھر بھی خاموش رہیں یا پھر آنسو بہانا شروع کر دیے اور ماں کے پلو سے لگ کر، بیٹھ کر منہ بسور رہی ہیں۔ میں ان عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی بلکہ ان سے الگ اور بالکل الگ تھی۔ بھائی نے اگر ایک تھپڑ رسید کیا یا ایک مکا مارا تو اس کے جواب میں دو ضرور مارتی تھی کیونکہ میرا اپنا الگ وجود تھا جس پر وہ ضرب لگانا چاہتے تھے جسے میں کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اماں اور ابا بھی میری اس عادت سے سخت نالاں رہتے۔ کبھی کبھی اماں غصے میں کہتیں کہ تجھے لڑکی نہیں لڑکا ہونا چاہیے تھا، کم سے کم ناک تو نہ کٹتی اگر تیری یہی عادتیں رہیں تو ہم سب سماج میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ کون تجھ سے شادی کرے گا کس کے گھر تجھے بھیجیں گے۔

ان کی اس لاف وگزاف کا میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن میں گھر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ بھائی سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے مجھے کئی مکے رسید کر دئے جس کا جواب اس کو ہمیشہ کی طرح ملا، مگر اماں کو یہ سخت برا لگا اور انھوں نے میری پٹائی کر دی۔ ان کا میرے اوپر ہاتھ اٹھانا مجھے اس قدر برا لگا کہ میں نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میں گھر سے نکل گئی جس کے بعد میں کبھی پلٹ کر گھر واپس نہیں گئی۔ انھوں نے مجھے تلاش کیا یا نہیں مجھے نہیں معلوم مگر میں نے ان لوگوں کو کبھی تلاش نہیں کیا کیونکہ مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔

جب میں اس خونی رشتے اور تعلق کو نہیں نبھا سکی تو دوسرے تعلق میرے لیے بھلا کیا معنی رکھیں گے۔ اس نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر خود بولنا شروع کر دیا۔

زندگی میں کسی تعلق کو میں نے بوجھ نہیں بنایا۔ جب جس سے ضرورت پڑی تعلق بنایا اور اپنے راستہ چل دی۔ نہ خود کسی پر بوجھ بنی اور نہ کسی کو بوجھ بننے دیا اگر کسی نے نزدیک آنے کی کوشش کی تو اس کو اتنی دور اٹھا کر پھینکا کہ پھر وہ کبھی مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکا۔

وہ بولے جا رہی تھی، دیکھو زندگی بغیر تعلق کے تو کٹ ہی نہیں سکتی، ہر ہر قدم پر تعلق بلکہ تعلقات کی ضرورت پڑتی ہے مگر میں ان کو زندگی کا صرف وسیلہ سمجھتی رہی مگر دوسرے اسی کو زندگی سمجھتے ہیں، مجھ میں اور ان میں یہی فرق ہے۔ اب بھی بہت سے لوگ کنزرویٹو ہیں وہ اتنے فرسودہ خیالات کے حامل ہیں کہ انھیں دیکھ کر ہی غصہ آ جاتا ہے۔ ارے بھائی جب تک ضرورت ہے تعلق ہے، ضرورت ختم تعلق ختم۔ اب یہ کیا ہے کہ چپکے پڑے ہیں، ایک دوسرے کو ڈھو رہے رہیں۔ جس طرح ضرورتیں بدل جاتی ہیں اسی طرح اشخاص بھی بدل جاتے ہیں اور میں نے تو کبھی کسی سے کوئی امید ہی نہیں کی اس لیے اگر کسی نے مجھ سے رابطہ منقطع کیا تو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں کی اور نہ رابطہ کی کوشش کی ہاں جب میری ضرورت پڑی تو کبھی مجھے تامل بھی نہیں ہوا کیونکہ میں تو اسی کی قائل ہوں۔

کافی دیر تک اس فلسفے کی وہ تشریح کرتی رہی اور میں تصورات میں اس کے ماضی میں کھویا رہا۔ میں اس کے نین نقش دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا جب آج یہ عالم ہے تو کل کیا رہا ہوگا۔ کتنی بجلیاں گری ہوں گی اور کتنے اس کی زد میں آئے ہوں گے کتنے ایسے رہے ہوں گے جو ان کے فیصلہ کی نذر ہوئے ہوں گے۔

کیا زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے آپ کو سمجھا ہو یا جس کو آپ نے سمجھا اور سوچا ہو کہ اس کے ساتھ آپ پوری زندگی ہنسی خوشی گذار دیں گی۔

اس نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔ اس کا جواب میرا پہلا جملہ ہی ہے۔

ہاں زندگی میں بہت سے لوگ آئے مگر میں نے کسی کو خود پر بوجھ نہیں بننے دیا کیونکہ میں اس کی قائل ہی نہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تک صرف تقریر ہوئی ہے، زندگی کا کوئی ایسا سرا میرے سامنے نہیں آیا جس کو بنیاد بنا کر میں تھوڑا آگے بڑھ سکوں۔ اس لیے میں بار بار اس کو کرید رہا تھا۔ میں نے پھر ایک سوال کیا۔

اچھا یہ بتائیے جو شخص آپ کو زیادہ اچھا لگا اس کے ساتھ کتنے دن رہیں؟

یہ سوال سن کر اس کے چہرے کا رنگ ذرا متغیر ہوا مگر کچھ سوچ کر وہ پھر مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میری آنکھوں میں تھوڑی سی چمک پیدا ہوئی اور مجھے لگا کہ شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس لیے بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے بیڈ پر کروٹ لیے خلا میں گھورے جا رہی تھی۔ مسکراہٹ کی چمک کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور میں اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وقفہ تھوڑا طویل ہو گیا تو میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ہاں بتائیں۔ یہ سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی۔

میری اور اس کی عمر میں بڑا تفاوت تھا۔ میں نیا نیا یہاں تعینات ہوا تھا جب کہ وہ عمر کے آخری پڑاؤ میں تھی، اس کے باوجود ہم دونوں بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ دراصل ماہر نفسیات ہونے کی وجہ سے مجھے اندازہ تھا کہ کب کس سے اور کیسے بات کرنی چاہیے اسی لیے گذشتہ پانچ

دنوں میں اس کو میں نے نہیں چھیڑا تھا۔ مگر آج جوں ہی مجھے موقع ملا میں نے اس سے پھر پوچھنا شروع کیا اور اس کے اندر جو بھی تھا سب باہر نکلنے لگا۔

ہاں اس نے نظر ڈالی اور بولی پڑھائی کے دنوں میں ایک دوست بہار بن کر آیا تھا جس کے ساتھ کا میں خواب دیکھا کرتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ یہ شخص جیون ساتھی کے لائق ہے اور لائق ہی کیا وہ آئیڈیل لگتا تھا اس لیے میں نے خود آگے بڑھ کر اس سے رابطہ قائم کیا اور گفتگو شروع کر دی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگتا اور وہ بھی مجھ میں دلچسپی لینے لگا تھا، اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ہر وقت وہ بچھا رہتا، کبھی مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونے دیتا۔ دن ہو یا رات ہر وقت میری ہر بات ماننے کے لیے تیار تھا۔ میں بھی دل و جان سے اس کی قدر کرتی تھی۔ کسی بات کا انکار نہیں کرتی، ہر بات مانتی تھی۔ ایک دن میں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو ختم ہوتی جا رہی ہوں، روبوٹ بنتی جا رہی ہوں، اس کی ہر بات کی تعمیل میری زندگی بنتی جا رہی ہے۔ یہ کیا؟ یہ تعلق خوبصورت ضرور ہے مگر اس قدر حاوی ہوتا جا رہا ہے کہ میں غائب ہو رہی ہوں اور وہ میری مجبوری بنتا جا رہا ہے اس لیے میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرتے ہوئے اس سے اس کو باخبر بھی کر دیا۔

اب میں ایک بار پھر تنہا ہو گئی، مگر مجھے کوئی ملال نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی خوشی تھی۔ وہ خوشی مجھے اندر سے طاقت دے رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ روبوٹ نہیں، میں بھی انسان ہوں اور میرا بھی ایک وجود ہے۔ یہ سرشاری میرے لیے کافی تھی کیونکہ میں کسی کی دست نگر نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے ایک جھٹکے میں اس بوجھ کو اتار کر میں نے پھینک دیا۔ جن صاحب سے میرا تعلق تھا ان کا کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی ان کی طرف پلٹ کر دیکھا نہیں اور اگر انھوں نے رابطہ کی کوشش کی تو اس کو اہمیت نہیں دی۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ کنارے لگ گئے۔

اسکالرشپ کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی جبکہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست ایک این جی او نے کیا تھا۔ اب میں ہاسٹل میں رہ رہی تھی اس لیے کسی چیز کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ میرے ایک ٹیچر تھے جو مجھ پر بہت مہربان ہو گئے اور ان کی عنایتیں کچھ زیادہ ہو گئیں۔ میں ان عنایتوں سے تو نہیں گھبرائی کیونکہ مجھے خود پر یقین تھا لیکن کسی دوسرے کو باز رکھنے کے لیے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ایک شخص پر پھر میری نظر پڑی جو خود اس بات کا خواہاں تھا کہ ہم رابطے میں آ جائیں۔

زندگی کیا تھی پر شور انداز میں آگے بڑھتی جا رہی تھی، میں اس کی کشتی پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے درمیان محو سفر تھی۔ مجھے اپنی زندگی سے کبھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔ اس نے مجھے بہت خوشیاں دیں بلکہ مجھے میری زندگی دی، جسے میں نے جیا اور خود کو سکون پہنچایا۔

زندگی سے اگر خوشی لینا ہے تو اس کو باندھ کر، جکڑ کر، اس کو کسی کا غلام بنا کر اپنا مقصد نہیں حاصل کر سکتے بلکہ اس کو آزاد چھوڑ دیں، نہ بوجھ بنیں اور نہ ہی کسی کو بوجھ بننے دیں۔ جب بھی کوئی بوجھ بننے کی کوشش کرے۔ دل پر ذرا سا جبر کریے اور اٹھا کر اسے اتنی دور پھینکیے کہ دوبارہ آپ کے قریب نہ پھٹک پائے۔ اس میں تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی مگر بعد میں یہی فیصلہ بے انتہا خوشی کا ذریعہ بھی بن جائے گا۔

وہ اپنی کہانی اپنی زبانی سنائے جا رہی تھی اور میں بڑے غور سے سن رہا تھا کیونکہ یہ بڑی دلچسپ کہانی تھی لیکن کہیں کہیں مجھے اس کی باتوں اور اس کے خیالات سے اختلاف بھی تھا اس کے باوجود میں خاموش تھا۔ وہ اپنی زندگی گذار چکی اب میرے بولنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے اس کی کہانی سننے میں ہی فائدہ تھا اگر میں اس کو بیچ میں ٹوکتا تو ممکن تھا کہ مجھے بھی وہ بوجھ سمجھ لیتی اور بات کرنا ہی بند کر دیتی اس طرح میں اپنے مقصد میں بھی ناکام ہو سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ہاں بیچ بیچ میں سوال ضرور کر لیتا تھا تاکہ اس کو بھی اس بات کا احساس رہے کہ کوئی اس کی کہانی میں دلچسپی لے رہا ہے اور کوئی ہے جو اسے توجہ سے سن رہا ہے۔

میں نے پھر سوال کیا تو آپ کے ٹیچر اور ان صاحب کا کیا ہوا جن پر آپ کی نظر پڑی تھی۔

میرا سوال سن کر وہ مسکرانے لگی۔

اس نے کہا ہوا کیا دونوں پھر اپنے انجام کو پہنچے، بھلا میں کسی کو کب تک برداشت کرتی اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا آپ کے مطابق جہاں تک ممکن ہو سکا ساتھ میں رہے اور پھر اپنے اپنے راستے ہو لیے۔ آخری جملہ ذرا زور دے کر ادا کیا۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جملہ کچھ خاص ہے۔

میں نے کہا لیکن......... میرا جملہ وہ کاٹتے ہوئے بولی لیکن ویکن کچھ نہیں آپ مردوں کو نہیں جانتے یہ سب شکاری ہوتے ہیں شکاری۔ سب شکاری بن کر آئے تھے، وہ پہلے والے بھی ان کی محبت بھی شکاری ہی تھی، وہ تو میری زندگی کو ہی شکار کرنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو اور ان کے جال کو ایسا پھاڑا کہ ان کا ہی وجود پھٹ گیا۔ حالانکہ اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی اور میری تو بالکل نہیں تھی بلکہ غلطی کسی کی نہیں تھی وہ تو

حالات تھے کہ شکار، شکاری، اور جال سب الگ الگ ہوگئے اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اسی طرح ٹیچر صاحب کی عنایتیں بھی جال ہی تھیں مگر ان کو ایک ایسے چاقو سے کاٹا جسے انھوں نے ہی تیار کیا تھا اور ہاں اس چاقو کو بھی میں نے کاٹ دیا کیونکہ اگر میں نہ کاٹتی تو وہ مجھے کاٹ دیتا اور چاقو کی فطرت کاٹنا ہی ہے اس لیے یہ ضروری تھا۔ اس طرح میں اپنی زندگی کا سفر کا آگے بڑھاتی رہی۔

وہ کچھ کہنے جارہی تھی کہ خود کو روکا اور پھر بولی ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔

میں اس کی طرف سراپا انتظار بن کر دیکھنے لگا تو وہ کہنے لگی پہلے چائے کے لیے بولیے، بہت تھک گئی ہوں۔

میں نے فوراً بیل بجائی اور چپراسی حاضر ہوگیا، میں نے اس سے دو چائے لانے کو کہا اور تاکید کردی کہ وہ جلدی لائے، وہ چلا گیا۔

میں نے کہا ہاں بتایئے۔

اس نے میری بات کو بہت لاپروائی سے سنا اور بولی بہت تھک گئی ہوں۔ پہلے چائے پی لوں پھر بولوں گی، اور آنکھیں بند کرلی۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ عورت کس نفسیات کی حامل ہے۔ اس کی نفسیاتی گرہ میرے ہاتھ نہیں آرہی تھی اور زیادہ سوال مناسب نہیں تھے کیونکہ وہ کسی وقت بھی ماچس کی تیلی کی طرح ذرا سی رگڑ سے بھڑک سکتی تھی۔ اس لیے میں نے چائے کے انتظار کو ہی مناسب سمجھا۔

چپراسی کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ٹرے سے کپ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگالیا جیسے اس کو اس کا بڑی دیر سے انتظار تھا۔ چائے کی چسکی لیتے ہی توانائی اس میں پھر لوٹ آئی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی، ہاں! آپ کیا پوچھ رہے تھے؟

میں نے کہا میں پوچھ نہیں رہا تھا آپ کچھ بتانے والی تھی جو بتانا بھول گئی تھیں، اس نے دماغ پر ذرا سا زور دیا اور بولی ان پرنسپل صاحب کو تو بھول ہی گئی جو مسلسل گردش میں رہا کرتے تھے مگر وہ بھی کچھ دن ہی رہے اور ایک دن ان کو بھی چلتا کردیا۔

میں اس کی داستان حیات سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کس دنیا کا کردار ہے۔ کیا یہ اسی دنیا میں جیتی ہے، جس میں ہم سب سانس لے رہے ہیں۔

اتنے میں اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کیا سوچ رہے ہو ڈکٹر صاحب، کہاں کھو گئے؟

میں نے تپاک سے جواب دیا کہ کہیں نہیں، میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا، کیا اس نے میرا اندرون دیکھ لیا ہے یا میری سوچ اس کو معلوم ہوگئی ہے۔

اس نے کہا میاں زیادہ مت سوچو۔ یہ سلسلہ آج کا نہیں بہت پرانا ہے، ذرا تاریخ پر نظر دوڑاؤ سب سمجھ میں آجائے گا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں بس 18 ویں صدی میں جھانک کر دیکھو وہیں کئی کردار ایسے مل جائیں گے جنھوں نے عورت ہوتے ہوئے اپنی بھرپور زندگی جی، وزیر خانم کا نام سنا ہے آپ نے؟ پھر خود ہی بولی آپ تو ڈاکٹر ہیں، اگر تاریخ یا ادب کے طالب علم ہوتے تو جانتے خیر کوئی بات نہیں، پھر بولی، اس وقت تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت اپنے فیصلے میں خود مختار ہوگی تو میں نے اگر آج کے دور میں اپنے فیصلے کیے تو اس میں برا کیا ہے۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا کچھ برا نہیں ہے جو بھی آپ نے کیا سب درست کیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنی بھرپور زندگی جی ہے۔ اپنی زندگی کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دی۔ آپ تو آج کی خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں۔

یہ سن کر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

اب میں اپنے مقصد کی طرف آیا کیونکہ اس سے بہتر دوسرا کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا۔

میں نے کہا آپ نے بڑی خوبصورت زندگی گذاری ہے تو کیوں آخری وقت یہ فیصلہ لے رہی ہیں۔ اپنی موت کے پروانے پر کیوں دستخط کررہی ہیں۔ جو بھی بچی ہے، اچھی ہی گذرے گی۔

یہ سن کر وہ بھڑک گئی اور مجھ پر چیخنے لگی۔ کون ہوتے ہیں آپ میری زندگی کا فیصلہ کرنے والے، یہ میری زندگی ہے جیسے چاہوں ختم کرلوں اور ہاں مجھے کسی پر بوجھ نہیں بننا اس لیے میں نے ایوتھینزیا کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ مجھ سے میرا حق سلب نہیں کرسکتے۔

میں نے اس کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا آپ خفا نہ ہوں آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا، یہ تو بس میرا مشورہ تھا اور میں نے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔ جس پر وہ دستخط کرنے لگی اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کا یہ فیصلہ غلط ہے یا درست؟

□□□

Mohd. Haneef Khan
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

غزلیں

ادا جعفری

عالم ہی اور تھا جو شناسائیوں میں تھا
جو دیپ تھا نگاہ کی پرچھائیوں میں تھا

وہ بے پناہ خوف جو تنہائیوں میں تھا
دل کی تمام انجمن آرائیوں میں تھا

اک لمحۂ فسوں نے جلایا تھا جو دیا
پھر عمر بھر خیال کی رعنائیوں میں تھا

اک خواب گوں سی دھوپ تھی زخموں کی آنچ میں
اک سائباں سا درد کی پروائیوں میں تھا

دل کو بھی اک جراحت دل نے عطا کیا
یہ حوصلہ کہ اپنے تماشائیوں میں تھا

کٹتا کہاں طویل تھا راتوں کا سلسلہ
سورج مری نگاہ کی سچائیوں میں تھا

اپنی گلی میں کیوں نہ کسی کو وہ مل سکا
جو اعتماد بادیہ پیمائیوں میں تھا

اس عہد خود سپاس کا پوچھو ہو ماجرا
مصروف آپ اپنی پذیرائیوں میں تھا

اس کے حضور شکر بھی آساں نہیں ادا
وہ جو قریب جاں مری تنہائیوں میں تھا

کیا جانیے کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

پھولوں کے کٹوروں سے چھلک پڑتی ہے شبنم
ہنسنے کو ترے پیچھے بھی سو بار ہنسی ہوں

تیرے لیے تقدیر مری جنبش ابرو
اور میں ترا ایمائے نظر دیکھ رہی ہوں

صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنت انساں
میں جنت انساں کا پتہ پوچھ رہی ہوں

دل کو تو یہ کہتے ہیں کہ بس قطرۂ خوں ہے
کس آس پہ اے سنگ سر راہ چلی ہوں

جس ہاتھ کی تقدیس نے گلشن کو سنوارا
اس ہاتھ کی تقدیر پہ آزردہ رہی ہوں

قسمت کے کھلونے ہیں اجالا کہ اندھیرا
دل شعلہ طلب تھا سو بہرحال جلی ہوں

گلشن بانو وفا

غزلیں

جو دل سے ماں کی محبت کبھی جدا نہ کرے
نصیب اس کا یہ ممکن نہیں وفا نہ کرے

نہ دل میں خوف خدا اور نہ ہو تمیز حرام
ہوس پرست کو اتنا بھی رب عطا نہ کرے

یہ کیوں ہے کیا ہے کوئی نام دے نہ دے دنیا
سوائے میرے کسی سے بھی وہ ملا نہ کرے

کسی مقام پہ کم ظرف میں شمار نہ ہو
کسی سے بھی کبھی اظہار مدعا نہ کرے

دل ریزہ ریزہ ہو اور عمر بھر ندامت ہو
وفا یہ چاہیے ایسی کوئی خطا نہ کرے

نقاب شرم و حیا کا رخ پے جو ہم نے اپنے گرا لیا ہے
پریشان کیوں ہے صنم تو اتنا بتا تیرا کیا چرا لیا ہے

خفا ہے مجھ سے جہان سارا بتاؤ مرضی ہے کیوں حسد ہے
اکیلے کرنا سفر ہے مشکل انھیں جو اپنا بنا لیا ہے

چمک رہا ہے یہ میرا آنگن اتر رہا ہے قمر فلک سے
کہ چودھویں کی حسین شب میں ترا تصور جگا لیا ہے

ہنسی سجا لو لبوں پے اپنے سکوں کو دل میں دبا کے رکھو
خوشی کا احساس اس کو ہو گا غموں کا جس نے مزا لیا ہے

اندھیرے ڈرتے ہیں روشنی سے کہا ہے جس دن سے یہ وفاؔ نے
نہیں ہے غم مجھ کو آندھیوں کا چراغ الفت جلا لیا ہے

Gulshan Bano 'Wafa' (Gulshan Bano)
D/o. Mr. Irfan Khan
Mohallah Bibi Zai Hadaf
Near Pakka Talab
Shahjahanpur-242001 (U.P)

لذیذ پکوان

ویج کباب

اگر فرج میں بچی ہوئی سبزیاں جمع ہوگئی ہوں تو اس سے فائدہ اٹھایئے ۔تمام سبزیاں جیسے آلو، ساگ ،مولی، گوبھی، شلغم، بینس، گاجر، بیگن کو کسی بھی قسم کے پکے ہوئے چاول میں ملا کر میشر سے میش کر لیجیے اور سبزی میں دو تین آلو ابال کر وہ بھی میش کر لیجیے۔اب اس میں تھوڑا سا بھنا ہوا بیسن ملا لیجیے یا آپ چنے کی دال ابال کر ملا لیجیے۔دونوں میں سے ایک چیز شامل کیجیے۔اس میں باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا، پیاز، ادرک،

ہری مرچ جو آپ ڈالنا چاہیں ڈال دیں پھر سوکھی بریڈ کو مکسر میں پیس کر بریڈ کرم بنا لیں اگر سوکھی بریڈ نہ ہو تو تازی کا بنا لیں اور اسے توے پر بھون کر ہلکا سا سکھا لیں۔سبزی میش کر کے اس میں حسب ذائقہ نمک، مرچ، گرم مصالحہ، کٹا ہوا زیرہ ملا لیں اور کباب جس شیپ میں چاہیں بنا کر بریڈ کرم لگا کر فرائی کر لیں۔لذیذ ویج کباب تیار ہیں۔آپ تازی سبزیوں کو ابال کر بھی اسی طرح بنا سکتے ہیں۔

(نصرت شمسی، رام پور)

فرائنگ پین پیزا

چکن تکہ کے لیے:

چکن بریسٹ دو عدد، ادرک لہسن پیسٹ آدھا چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، مرچ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، (زیرہ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ بھنا ہوا)، لیموں کا رس دو کھانے کے چمچ، دہی ایک کھانے کا چمچ

ڈو بنانے کے لیے:

میدہ ڈیڑھ کپ، نمک آدھا چائے کا چمچ، خمیر ایک چائے کا چمچ، کاسٹر شوگر ایک چائے کا چمچ، آئل تین سے چار کھانے کے چمچ، پانی حسب ضرورت

ٹاپنگ کے لیے:

پیزا ساس چار کھانے کے چمچ، (پیاز دو عدد (سلائس میں کٹے ہوئے) چکن تکہ آدھا کپ (ریشے دار)، ٹماٹر ایک عدد (کٹا ہوا)، شملہ

مرچ ایک عدد (کٹی ہوئی)، مشروم تین عدد (سلائس میں کٹی ہوئی) اور یگانو پتے ایک چائے کا چمچ، چیڈر چیز آدھا کپ (کدوکش)، آئل چار کھانے کے چمچ

چکن تکہ کے لیے: پین میں دو عدد چکن بریسٹ کے ٹکڑے شامل کریں اور ادرک لہسن پیسٹ، نمک، مرچ پاؤڈر، بھنا ہوا زیرہ، لیموں کے رس اور دہی کے ساتھ میرینیٹ کر لیں۔ پندرہ منٹ کے لیے چکن ایک طرف رکھ دیں۔ پھر اسے چکن گل جانے تک گرل کر لیں۔ آخر میں گرم کوئلے چکن پر پھیلا دیں اور تھوڑا سا تیل چھڑک دیں۔ ڈھانپ کر دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

پیزا کے لیے: ایک پیالے میں میدہ، نمک، خمیر، آئل اور کاسٹر شوگر مکس کر لیں۔ نیم گرم پانی کے ساتھ آمیزہ گوندھیں یہاں تک کہ ڈو تیار ہو جائے۔ اب اس ڈو کو تیس منٹ کے لیے ڈھانپ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیں۔ پھر ڈو کو نو انچ کے پیزے کی شکل میں رول کر لیں۔ فرائی پین میں دو کھانے کے چمچ آئل ڈال کر ہلکی آنچ پر گرم کریں۔ ڈو کو تین منٹ کے لیے ایک سائیڈ سے گرم کر لیں پھر اسے پلٹیں دوسری سائیڈ بھی دو کھانے کے چمچ آئل سے ہلکا سنہری کر لیں۔ پھر اس کے اوپر پیزا ساس پھیلا دیں۔ ساس کے ساتھ پیاز، چکن تکہ، ٹماٹر، شملہ مرچ اور مشروم کے ساتھ ٹاپنگ کریں اور یگانو پتے اور کدوکش کی ہوئی چیڈر چیز پیزا پر چھڑک دیں۔ پانچ منٹ کے لیے گرل کر لیں یہاں تک کہ چیز پگھل جائے۔ ٹکڑوں میں کاٹ کر گرم گرم سرو کریں۔

گلاب جامن

اجزا: خشک دودھ ایک پیالی، سوجی آدھی پیالی، میدہ آدھی پیالی، پھیکا کھویا آدھی پیالی، بیکنگ پاؤڈر چوتھائی چائے کا چمچ، تیل دو کھانے کے چمچ

ان سب چیزوں کو اچھی طرح ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں اور پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں، پھر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لیں

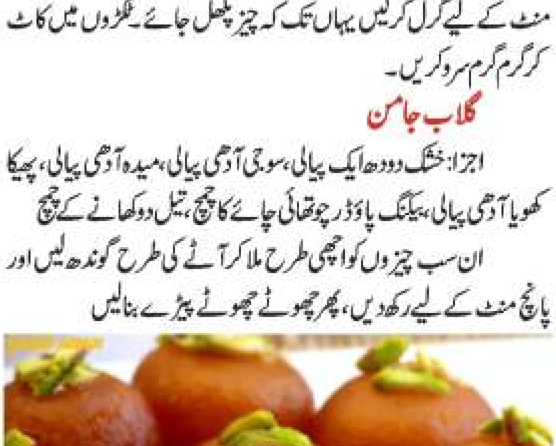

شیرا بنانے کے لیے:

چینی دو پیالی، پانی ایک پیالی، چھوٹی الائچی آٹھ عدد، دانے نکال کر باریک پیس لیں۔

ترکیب: چینی میں پانی ملا کر ہلکی آنچ میں شیرا بنا لیں۔ جب شیرا بننے لگے تو الائچی ڈال کر اتار لیں۔ ایک کڑھائی میں گھی گرم کریں۔ گھی تقریباً دو پیالی ہونا چاہیے تاکہ گلاب جامن اچھی طرح تلے جاسکیں۔ جب گھی تیز گرم ہو جائے تو ہلکی آنچ کر کے پیڑے تلنا شروع کر دیں، جب براؤن ہو جائیں تو نکال کر شیرے میں ڈال دیں۔ گلاب جامن شیرے میں ڈال کر آنچ میں دم پر رکھ دیں۔

مٹر پلاؤ

اجزا: مٹر ایک کلو، چاول باسمتی ایک کلو، سیاہ زیرہ آدھا چائے کا چمچ، ثابت کالی مرچ چھ عدد، تیز پات ایک پتا، بڑی الائچی تین عدد، سونف آدھا چائے کا چمچ، لہسن ثابت بغیر چھلا ہوا ایک گٹھی، ثابت دھنیا ایک چائے کا چمچ، ادرک ایک چھوٹا سا ٹکڑا، چھوٹی الائچی تین عدد، پیاز درمیانی ڈلی دو عدد باریک کٹی ہوئی، دہی ایک کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، گھی ایک کھانے پکانے والا چمچ

ترکیب: سب سے پہلے ایک دیگچی میں آٹھ پیالی پانی ڈال لیں۔ اس میں لہسن، ادرک، سونف، دھنیا گرم مصالحہ اور تھوڑا سا نمک ڈال کر ابال لیں۔ پھر چھان کر رکھ لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی ڈال کر پیاز براؤن کریں۔ جب براؤن ہو جائے تو آدھی پیاز نکال کر اخبار پر پھیلا کر رکھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اب باقی بچی ہوئی پیاز میں دہی چھوٹی الائچی اور تھوڑا گرم مصالحہ ڈال کر مٹر ڈال دیں، تھوڑا سا بھون کر یخنی والا پانی ڈال دیں۔ جوش آنے پر چاول اور نمک ڈال کر ڈھانک دیں۔ چاول کا سوا سوکھ جائے تو براؤن کی ہوئی پیاز ڈال دیں اور ہلکی آنچ میں توے پر رکھ دیں۔

(بحوالہ www.khanapakana.com)

حسن الدین احمد، غلام احمد

سورج کی کرنوں کی شفا بخش قوت

ہم جانتے ہیں کہ سب سے پہلے اس حقیقت پر اہل ہند کی نظر پڑی۔ لیکن ہم نے اپنے اسلاف کے خزانوں کی حفاظت نہیں کی اور وہ دوسروں کے حوالے ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا اور دوسروں نے اس سرمایہ سے فروغ حاصل کیا۔ ایسی حالت میں اس کو اپنا کہہ کر نازاں ہونا بجز حماقت کے کچھ نہیں۔ بقول 'پدرم سلطان بود' ہم تو تہی دامن ہی رہے بلکہ اپنی آبائی دولت کو ٹھکرا دیا اور دوسروں نے اس سے نہ صرف خود استفادہ کیا بلکہ دوسروں کو بھی مستفیض کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم یونان کے حکیم بقراط پر نظر ڈالتے ہیں جس نے چار سو سال قبل مسیح رب الشمس یعنی سوریہ دیوتا کے عظیم الشان مندر کے سامنے بمقام کوس پہلی مرتبہ سورج کی کرنوں کے ذریعہ امراضِ انسانی کے علاج کا تجربہ شروع کیا اور ایک آئینہ کا شفاخانہ بنایا جس میں چاروں طرف سورج کی کرنیں جسم انسانی پر پڑتی تھیں اور جہاں انسان کو برہنہ بٹھا کر امراض کا علاج کامیاب طریقہ پر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ماہر اثار قدیمہ کالون نے اس گھر کا پتہ لگایا ہے۔

بقراط کے بعد جالینوس وغیرہ حکما نے شمسی علاج کے سلسلے کو جاری رکھا اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ اس علاج کے طریقے کو اہل روما نے بھی یونان سے سیکھا اور اپنے ہاں حمام شمسی کے علاج کو ترقی دی جس کے کھنڈر آج بھی اپنی یاد کو تازہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔

جب یورپ کی تاریکی (جہالت) پر آفتاب علم کی کرنیں حکماء اسلام کے لینس سے ضیا پاش ہونے لگیں تو سب سے پہلے فرانس کے نامور طبیب پس تیور نے اس علاج کی تائید میں اپنی آواز بلند کی اور اعلان کیا کہ...... "سورج کی کرنوں سے امراض انسانی کا علاج آسانی سے ہو سکتا ہے۔" حکیم موصوف کے اس مختصر جملہ نے یورپ کے ماہرین طب کی توجہ علاج شمسی کی طرف موڑ دی اور اس سلسلے میں نت نئے تجربات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی میں سر آئزک نیوٹن نے سورج کا منشور مثلثی (یعنی تکونی لینس) تیار کیا اور انیسویں صدی کے آغاز پر ماورائے بنفشی کرن اور زیریں سرخ کرن یہ دو خاص نظر سے اوجھل کرنیں یعنی غیر مرئی شعاعیں دریافت ہوئیں اور 1892 میں ڈاکٹر نکلس ریگ فینس نے اس علاج کو ایک کامیاب طریقہ سائنس کے ذریعہ یورپ کے سامنے پیش کیا اور مختلف آلات کے ذریعہ نیز مختلف رنگین برقی شعاعوں سے علاج کے ذرائع مہیا کر دیے۔

ڈاکٹر اے۔ رولیر نے سوئٹزرلینڈ میں 1902 میں علاج شمسی کا پہلا دواخانہ امراض لا علاج کے لیے قائم کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

سورج کی کرنوں کا راز

بظاہر ہمیں سورج کی کرنیں سفید یا زرد نظر آتی ہیں حالانکہ ان سفید یا شفاف کرنوں کو قدرت نے مختلف رنگوں سے مرکب بنایا ہے اور ہر رنگ کے اثرات جداگانہ ہیں۔ بعض رنگ کی کرنیں جسم کے اندرونی حصوں میں دور تک پہنچ جاتی ہیں اور بعض جسم کے اوپری حصوں میں رہ جاتی

ہیں......بعض رنگ کی کرن نور پیدا کرتی ہے تو بعض صرف گرمی۔ کوئی رنگ کیمیائی تاثیر سے ہوتے ہیں تو کوئی انقلابی کیفیات کا حامل ہے۔ اگر ہم ایک تکونی سفید بلور سے روشنی کی طرف دیکھیں یا سورج کی کرنیں سفید بلور سے بنا دیں تو اس کے عکس میں ہمیں سات رنگ نظر آئیں گے۔ حالانکہ بلور شفاف سفید ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قدرت نے سورج کی کرنوں کو رنگوں سے مرکب کیا ہے۔

یہ بات تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ سورج کی روشنی میں جراثیم کو مارنے کی زبردست قوت ہے۔ چنانچہ آج ڈاکٹری میں ہر مرض کا سبب جراثیم کو قرار دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے کہ جراثیم کو مارنے کی قوت سورج کی کرنوں سے بڑھ کر اور کسی میں نہیں ہے۔ پس ڈاکٹری میں بھی صحت کے لیے سورج کی روشنی، کھلی ہوا اور صاف پانی لازمی قرار دیا گیا ہے۔

حکمائے نباتات بھی سورج کی کرنوں کے ذریعہ پھلوں اور ترکاریوں میں حیاتین کی نشوونما تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی صحت کے برقرار رکھنے کے لیے قدرت نے کیا عظیم الشان عطیہ دیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ ہیٹ کا مقولہ ہے کہ:

قدرت کی لیبارٹری میں سورج سب سے بڑا شفا بخش آلہ ہے۔

پس جن اشخاص کو اپنی صحت عزیز ہے ان کو چاہیے کہ سورج کی صحت بخش کرنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر قدرت کے فیض عام سے کوئی لاپروائی برتتا ہے تو یقیناً وہ کسی نہ کسی شدید مرض کا شکار ہو جائے گا۔

ہندوستان نے کب اس علم کو حاصل کیا

جب ہم سنسکرت کے لفظ "سپت رشمی" کو دیکھتے ہیں اور اس کے معنی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو وہی سورج ہے جس سے سات کرنیں نکلتی ہیں جس کو موجودہ تحقیقات نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ لفظ سپت رشمی (یعنی سات رنگ والا) ایک ہزار سال قبل مسیح ہمارے حکمائے ہند کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے یورپ انھیں سات کرنوں کو لے کر آگے بڑھے اور اپنے قیمتی آلات سے دل و دماغ کی بازی لگا کر نہ دیکھنے والی شعاعوں کو دریافت کر لے جس کو وہ ایکس ریز (X-Rays) این ریز (N-Rays) الٹرا وائی لیٹ اور انفرا ریڈ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں اور اس سے مسیحائی کر رہے ہیں۔ پس یہ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ خزانہ تھا جس کو ہند کے حکمانے جمع کیا تھا اور ان کے جانشینوں نے اس کو کھو دیا۔ دوسروں نے اس کو اپنایا اور نہ صرف خود مالا مال ہو گئے بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو انھوں نے سنوار دیا۔

کرنوں کے ذریعے علاج

حکمانے کرنوں کے ذریعے علاج کے تین طریقے بتائے ہیں:

1۔ سورج کے بالراست کرن سے مرض کا علاج (سن باتھ) 1

2۔ سورج کی رنگین کرنوں کے ذریعہ مرض کا علاج (کلرس باتھ)

3۔ سورج کی رنگین کرنوں کو پانی یا تیل میں جذب کر کے مرض کا علاج (کروموپیتھی)

نمبر ایک کے لیے کسی قسم کے آئینہ یا رنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف سورج کی راست کرن جسم پر ڈالی جاتی ہے۔ اس مکتب خیال کا استدلال یہ ہے کہ سورج کی وہ تمام کرنیں جو دکھائی دیتی ہیں یا نہیں دکھائی دیتی یعنی مرئی و غیر مرئی شعاعیں ایک ساتھ جسم انسانی میں داخل ہو کر صحت و تندرستی کو بحال کر دیتی ہیں اور مرض دور ہو جاتا ہے۔ اس لیے مریض کو برہنہ سورج کی ہلکی کرنوں میں صبح اور شام سورج کے سامنے بٹھایا جاتا ہے تاکہ سورج کی کرنیں مجموعی طور پر جسم میں اثراتِ قوت مدافعت مہیا کر دیں جس کی وجہ سے مکمل صحت ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ اس مکتب خیال کا تصور ایک حد تک صحیح ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس مریض کو صرف نیلے رنگ کی شعاع کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے اس کو صحت پانے کے لیے زیادہ مدت درکار ہوگی۔ بمقابل نیلے رنگ کی شعاع کے غسل کے اور پھر جب یہ مسلمہ ہے کہ کبھی شعاع میں زرد اور سبز رنگ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

میں نے اس طریقہ علاج کو بارہا آزمایا ہے اور کامیاب نتائج حاصل کیے ہیں۔

لیکن رنگین شعاعوں کا تجربہ زود اثر بلکہ تیر بہدف دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرت انسانی مرض سے جلد صحت یاب ہونے کی مقتضی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایلوپیتھی (یعنی ڈاکٹری) کی طرف تمام دنیا کا میلان طبع محض اسی لیے ہے کہ فوری اثرات مرتب ہوتے ہیں (خواہ آئندہ کے لیے کیسے بد سے بدتر اثرات پیدا کیوں نہ ہوں)

قدرتی علاج کے معالجین کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تقلید جامد سے دور رہ کر ہر اس طریقہ کو قدرتی علاج کی بنیادوں پر اپنا لیں تاکہ ان کا فن اور ان کا مقصد کامیاب ہو جائے اور ترقی کے لیے زینے طے کرنے کا موقع ملے۔ 1

سورج کی کرنوں کا حیات انسانی پر اثر

اس علاج کے تمام اصولوں کا دارومدار سورج کی کرنوں کے حیات بخش فعل پر منحصر ہے۔ چونکہ سورج کی کرنیں قوت پیدا کرنے کے لیے گویا

ایک فیکٹری ہے جو ہمارے کرہ زمین کے لیے قدرت نے قائم کر دی ہے اور یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ دنیا کا ہر کیمیائی ردعمل سورج ہی کی کرنوں کا نتیجہ ہے جس کو ریڈینٹ انرجی (Radiant Energy) کہا جاتا ہے۔ یعنی قوت متحرکہ۔

ہر چھوٹا یا بڑا عنصر کرہ زمین میں سورج کی کرنوں کا محتاج ہے۔ لہٰذا ہر ذی حیات میں جس میں حضرت انسان بدرجۂ اولیٰ شامل ہے اپنی غذا کے لیے سورج کی محفوظ شدہ انرجی ہی حاصل کرتا ہے۔ یہی انرجی اجسام میں حرکت کا باعث ہے۔ اگر یہ بند ہو جائے تو حرکت کا خاتمہ ہو جائے گا جس کا دوسرا نام موت ہے۔ قدرت نے یہ سب کچھ ہمارے لیے مہیا کیا ہے۔ اس کی صراحت کے لیے لاکھوں صفحات سائنسدانوں نے سیاہ کیے ہیں اور اپنی عمریں لیبارٹری میں گزار دی ہیں، جس کو نہ میں خود کامل طور پر سمجھا ہوں اور نہ سمجھا سکتا ہوں اس لیے میں الکٹروں پروٹون کے منفی و مثبت کہربائی قوتوں اور ان کی جسامت کی کمیور اور وزن کی محیر العقول گرانی کی بھول بھلیاں یا ہائیڈروجن بم کے دھماکے میں اپنے ناظرین کے مقصد حصول صحت کو فنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس علاجِ شمسی کی ابتدا تاریخ اور اس کے مبادیات کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد میں اپنے اصلی مقصد کی طرف ناظرین کو اس امید کے ساتھ متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ ماضی اور اصول شعاع شمسی کی روشنی میں آئندہ سطور سے نہ صرف دلچسپی لی جائے گی بلکہ اس سے استفادہ حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے گی۔

1۔ ابوبکر یا زکریا الرازی نے دسویں صدی عیسوی میں سورج کی روشنی اور شعاعوں سے علاج کا اعلان کیا۔

قرآن میں الوانہ کذالک کا اشارہ ہے (27:35)

2۔ جراثیم کو مرض کے سبب کی حیثیت سے قدرتی علاج میں تسلیم نہیں کیا جاتا اور جراثیم کشی کو طریقۂ علاج کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا جاتا۔

3۔ سوریہ دیوتا سات رنگین گھوڑوں پو سواری کر رہے ہیں۔ ایسی تصویریں ہندو دھرم کے عقیدت مندوں کے لیے جاذب نظر ہیں تو غیروں کے لیے باعث حیرت و استعجاب ہے۔ یہ تصویر کیا ہے؟ سورج سے نکلنے والی سات شعاعوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

گر نہ بیند بروز شپر چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

4۔ قدرتی علاج کے حصہ اول میں ہم نے سن باتھ کی تفصیلات وضاحت سے بیان کر دی ہے۔

5۔ طبیب کا منشا اور مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ مخلوق خدا کی صحت برقرار رکھنے کے لیے اپنی توانیاں صرف کر دیں۔ ضد یا ہٹ سے طب کے مقدس فریضہ کو ٹھیس لگاتے ہوئے اپنی بات کو اونچی رکھیں۔ قابل ذکر ایک واقعہ ہے کہ ایک ایسے مریض کو جو عرصہ سے میرے مشورے سے علاج کر رہے تھے لیکن پرہیز وغیرہ نہ کرنے سے مکمل صحت نہ حاصل کر سکے۔ اس طرح مادہ فاسد بڑھتا گیا یعنی گردہ میں پتھر کی مقدار زیادہ ہو گئی اور اس کا اخراج ذرا مشکل ہی نظر آیا۔ اگر فوری طور پر فاسد مادہ کو خارج نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ پیچیدگی پیدا ہو جاتی، جب مجھ سے مشورہ لیا گیا تو میں نے فوری آپریشن کی رائے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپریشن کے بعد 7 تولہ وزن کے پتھر گردے سے برآمد ہوئے۔ گو گردہ نکال لیا گیا لیکن گردہ کی حالت اچھی تھی کوئی سڑاند نہ تھی ورنہ اتنے پتھروں کے بعد گردہ کا سڑ جانا ضروری تھا۔ یہ صورت حال محض روزانہ ہپ باتھ و اسٹیم باتھ کا نتیجہ تھی۔ آپریشن کے بعد پندرہ دن کے اندر صحت کامل حاصل ہو گئی۔ اب صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ہپ باتھ (Hip Bath) کا سلسلہ بغیر پرہیز کے جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ قدرتی علاج سے فاسد مواد تو اس قدر جلد خارج نہیں ہو سکتا تھا اور تاخیر نہ معلوم کیا اثرات فاسد پیدا کر دیتی۔ غور کیجیے کہ اشتراک علاج نے طب کے مقصد کو کس طرح کامیاب بنایا۔

(ماخوذ: فطری علاج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، چوتھی طباعت: 2010)

حسن کی نگہداشت

شہد، دہی، دودھ اور انڈے

شہد، دودھ، دہی اور انڈے انتہائی قیمتی معاون اور حسن و رعنائی ہیں کیونکہ یہ جلد کو غذائیت بخشتے ہیں۔ مثال کے طور پر انڈوں میں پروٹین اور فاسفورس کا آمیزہ ہوتا ہے جو غذائیت بخش ہے۔ بیوٹی ٹریٹمنٹ میں ان گنت مختلف نباتات استعمال ہو رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا آ رہا ہے جن میں عرق گلاب اور عرق چنبیلی شامل ہیں۔ یہ جلد کی ساخت اور رنگت کو نکھارتے ہیں۔ گرمیوں میں جلد چکنی ہو جاتی ہے اور چکنی جلد کو بہت توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چکنائی کی وجہ سے چہرے کے مسام کھل جاتے ہیں۔ ان کھلے مساموں میں میل جمنے کی وجہ سے چہرے پر کیل مہاسے اور دانے نکل آتے ہیں۔ اس سے نجات کے لیے جلد کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے اس کے لیے سب سے پہلے پانی اور غذا پر توجہ دیں۔ چکنائی اور تلی ہوئی اشیا سے پرہیز کریں۔ پھل اور سبزیاں ضرور استعمال کریں۔ چہرے پر کوئی کریم ہرگز نہ لگائیں۔ چہرے پر بھاپ لیں اور کچھ منٹوں بعد تولیہ سے صاف کر لیں۔ چہرے کے کیل نرم پڑ جائیں تو آہستہ سے دبا کر نکال لیں

اور چہرے پر برف کی ٹکور کریں، مسام بند ہو جائیں گے۔ اس کے بعد چہرے پر گھریلو ماسک لگائیں۔ ایک انڈے کی سفیدی، ایک چمچ شہد اور آدھا چمچ لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنا لیں اور چہرے پر لگائیں 20 منٹ کے بعد چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ ہفتہ میں ایک بار کے اس عمل سے چہرہ صاف و شفاف ہو جائے گا۔ اگر آپ کی جلد خشک ہے تو اپنی غذا پر زیادہ توجہ دیں۔ وٹامن یا آئرن کے حصول کے لیے ایسی چیزیں زیادہ استعمال کریں جن میں یہ وٹامن موجود ہوں اس کے علاوہ دن میں بارہ سے اٹھارہ گلاس پانی پئیں۔ ایلو ویرا عام پودا ہے ایک چمچ اس کا گودا لیں اور پیسٹ بنا کر چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد چہرہ دھو لیں۔ روزانہ یہ عمل کرنے

سے جلد کی نمی محفوظ رہتی ہے اگر ایلوویرا کا حصول مشکل ہو تو ایک چمچ شہد میں آدھا چمچہ لیموں کا رس ملانے سے بھی فرق پڑجاتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے آدھا چمچ گلیسرین میں آدھا چمچ ملائی اور لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اسے چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے کے بعد چہرہ دھولیں جلد تروتازہ اور شاداب ہوجائے گی۔ اس کے لیے احتیاط لازمی ہے۔ بازار کی مختلف کریمیں استعمال کرنے کے بجائے گھریلو ٹوٹکے استعمال کرنے چاہیے اور اس کے علاوہ دھوپ سے بچنا چاہیے۔

چہرے کی خوبصورتی کے لیے کھیرے کا ماسک

طبی ماہرین کے نزدیک کھیرا ایک بہترین سبزی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی عمدہ جزو ہے جس سے ہمیں کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ انھیں فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے چہرے کے لیے ایک قدرتی غذا کا کام کرتا ہے۔ چلیے آج ہم آپ کو کھیرے سے بننے والا ایک بہت ہی عمدہ فیس ماسک بتاتے ہیں جس سے یقیناً آپ کی جلد کو ایک نئی زندگی ملے گی۔

اجزا: کھیرا ایک عدد، لیموں کا رس ایک کھانے کا چمچ، انڈے کی سفیدی ایک عدد، پودینہ آدھا کھانے کا چمچ، شہد ایک کھانے کا چمچ، عرق گلاب ایک کھانے کا چمچ

ترکیب اور فوائد: کھیرا لیں اور اسے چھیل کر اچھی طرح پیس لیں۔ اتنا پیسیں کہ پیسٹ بن جائے۔ اب اس میں عرق گلاب، لیموں کا رس، پسا ہوا پودینہ اور شہد ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر انڈے کی سفیدی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس مکسچر میں ڈال دیں۔ جب اچھی طرح مکس ہو جائے تو اسے چہرے اور گردن پر لگالیں۔ اس پیسٹ سے آنکھوں کو بچانا ہے۔ پچیس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔ آپ کی جلد میں تازگی اور چمک آجائے گی۔ بہترین رزلٹ کے لیے ہفتے میں ایک دفعہ ضرور استعمال کریں۔

آلو کا ماسک

اگر آپ اپنی جلد کی رنگت کو نکھارنا چاہتی ہیں تو آلو کا ماسک لگائیں۔ کچا آلو چھیل کر اسے دو حصوں میں تقسیم کرلیں اور ایک ٹکڑا لے کر اچھی طرح کچل کر یا پیس کر کپڑے پر پھیلا کر چہرے پر لگائیں۔ اس ماسک کو بھی رات کو ہی استعمال کریں۔ تمام رات میں اس کا عرق جلد میں جذب ہوجائے گا۔ صبح روئی کے پھاہے کو پانی میں ڈبو کر اس کی مدد سے چہرہ صاف کرلیں۔ اس کے بعد منہ دھولیں۔ شلغم اور گاجر پانی میں ابال کر انھیں کچل لیجیے اور اس آمیزے کو تمام چہرے پر لگا کر آدھ گھنٹہ تک جذب ہونے دیں۔ وقت پورا ہونے پر دودھ میں بھیگی ہوئی روئی سے چہرے کو صاف کر لیجیے۔ یہ آپ کے چہرے کو میل سے صاف کر کے رنگ کو نکھار دے گا۔

(بحوالہ: www.roopsuraksha.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

’خواتین دنیا‘ جنوری 2019 یوم جمہوریہ اور نئے سال کی دل خوش کن سوغاتیں لیے روبرو ہے۔ اس مناسبت سے اس کے مشمولات بھی مرتب کیے گیے ہیں۔ نسوانی تعلیم پر پہلا مضمون (ص 5) بہت خوب ہے جو ساوتری بائی اور جیوتی با پھلے کی زندگی کی جدوجہد کے واقعات سے بھرپور ہے۔ اگر اسی تسلسل میں یہ مضمون جاری رہتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی۔ (ص 6) پر مضمون بعنوان ’عزیزن بائی‘ کو فاضل مصنف نے بڑی عرق ریزی سے سپرد قلم کیا ہے کیونکہ کم وبیش ڈیڑھ صفحہ کے اس مضمون کے لیے چار کتابوں اور ایک روزنامہ کو کھنگال کر رکھ دیا گیا ہے۔ منتخب اشعار میں (ص 8) پر شعر۔

ورق ورق میں سمو دے مجھے کتاب میں رکھ
میں زندگی ہوں مجھے وقت کے نصاب میں رکھ

بہت ہی عمدہ شعر ہے۔ (ص 14) پر دیا گیا مضمون ”گل کرسٹ“ درحقیقت بہت ہی غیر معمولی مضمون ہے۔ اگر انصاف پسند دل و ذہن ہو تو اس سے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ (ص 18) پر ”تانیثیت، خواتین فکشن نگار اور عورتوں کے مسائل“ پر مضمون دیا گیا ہے۔ مضمون کے مطابق یہ تحریک یعنی تانیثیت یورپ سے ہندوستان پہنچی۔ اسی صفحہ کے دوسرے پیراگراف میں درج ہے کہ اردو فکشن پر تانیثیت کا گہرا اثر ملتا ہے۔ اس تمام تر مقالہ کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی
(اقبال)

(ص 22) پر عبدالحلیم شرر پر دیا گیا مقالہ نہایت قرینہ سے لکھا گیا ہے۔ اسے بلاشبہ حاصل شمارہ کہا جا سکتا ہے۔ سبھی کہانیاں (ص 37 تا 50 صفحات پر) ہیں۔ حسن سخن کے تحت غزلوں میں زاہدہ زیدی کی غزل (ص 51) پسند آئی، لیکن نوید پروانہ کی غزل نما نظم ”حجاب“ نہایت متاثر کن رہی۔ لذیذ پکوان کے طریقے (ص 53) لذیذ ہی ہوں گے۔ کار دار طبی اعتبار سے ”خون کا دباؤ“ (ص 55) پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ خواتین خبرنامہ (ص 61) کے تحت تعجب خیز مگر دلچسپ خبریں دی گئی ہیں۔ یہ خبر تو خوب ہے کہ میری کوم نے 2002 سے 2010 تک کئی ورلڈ خواتین چمپئن کے خطابات جیتے ہیں۔ روح خورشید بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ 2013 تا 2018 تک انھوں نے 13 گولڈ میڈل حاصل کیے۔ اس طرح یہ شمارہ ہر رعنائی سے مزین ہے۔ اس میں باحجاب خود کلامی اور بے حجاب بلند گوئی بھی کچھ تو ہے اور کیا چاہیے؟

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

’خواتین دنیا‘ ماہ جنوری 19 نظر نواز ہوا۔ تمام مضامین معیاری اور قابل قدر ہیں۔ شخصیت سے لے کر تمام مضامین معلوماتی اور روزمرہ زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ سے دست بہ دست دعا گو ہوں کہ خواتین دنیا ہر گھر کی مطالعہ زینت رہے، کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار رہے۔ لائق صد مبارک باد ہیں اراکین خواتین دنیا کے جو اپنی نیک کوشش سے انتہائی کم نرخ پر اتنا معیاری رسالہ نکال رہے ہیں۔ اللہ رسالے کی عمر دراز کرے آمین۔ میری نیک خواہشات ’خواتین دنیا‘ کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔

مختار احمد۔ مختار میڈیکوز۔ 3/7 گیس اسٹریٹ راجہ بازار، کولکاتہ

جہاں پوری دنیا خواتین کی کامیابی اور صلاحیتوں کو دوسرے نمبر پر رکھتی آئی ہے وہیں کچھ اداروں اور لوگوں نے اس کی صلاحیتوں کو سراہا بھی ہے اور بلا تفریق جنس صرف اس کی کامیابیوں اور حوصلوں کو صف اول میں نہ صرف شمار کیا ہے بلکہ اس کے حوصلوں کو نئے پنکھ دینے میں بھی معاون ثابت ہوئے ہیں۔ قومی کونسل سے نکلنے والا 'خواتین دنیا' رسالہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یوں تو ملک میں بہت سے رسائل و جرائد ہیں جو صرف خواتین کے قلم کے لیے مختص ہیں یا ان کی تحریروں کو شائع کر کے ان کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں لیکن 'خواتین دنیا' ایک منفرد رسالہ ہے۔ سب سے پہلے اس کی قیمت جو ہر درجے کی خواتین تک پہنچنے کی سب سے اہم وجہ ہے۔ اتنی کم قیمت کا رسالہ اور اتنا معیاری اور خوبصورت رسالہ شاید ہی کوئی اور ہو ساتھ ہی خواتین کے قلم کو اولیت دینا نیز ہر قسم کے معیاری مضامین افسانے اور خواتین کی دلچسپی کا وہ تمام مواد اس پرچے میں شامل ہے جو ہر قسم کی خواتین کو فیض پہنچا سکتا ہے۔ نظم اور نثر کا معیاری مواد، خوبصورت دیدہ زیب صفحات، رنگین چھپائی اسے مزید خوبصورت اور اہم بناتے ہیں۔ اگر اس رسالے میں قسط وار ناول بھی شروع ہو جائے تو یہ دلوں میں گھر بنا سکتا ہے اور ایک انعامی سلسلہ شروع ہو جائے تو خواتین کی دلچسپی اور توجہ اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے مزید ترقی عطا فرمائے اور کونسل اسے اس سے زیادہ بہتر بناتے ہوئے یوں ہی شائع کرتی رہے۔

نصرت شمسی، انجمن اسٹریٹ، رام پور (یوپی)

الحمدللہ 'خواتین دنیا' جنوری 2019 کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ جیسے ہی فہرست پر نظر گئی اور اچانک ہی بنا توقع اپنا نام نظر آیا تو خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ اس کے لیے میں تہہ دل سے قومی اردو کونسل اور مدیر اعلی 'ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب'، مدیر منتظم 'ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی' اور خصوصاً نائب مدیر 'ڈاکٹر عبدالحی' صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھ خاکسار کی ایک کہانی 'نیکی کا صلہ' اس میں شامل کر کے ایک اور نیکی کا فریضہ انجام دیا۔ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جہاں 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' نہایت ہی کامیابی کے ساتھ شائع کر رہا تھا وہیں اس کی ایک اور نئی پیشکش 'ماہنامہ خواتین دنیا' نے ایک نیا ہی انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں ایک طرف 'نکہت سخن' کی محفل میں شاعرات کے مختلف اشعار سے لطف اندوز ہوئے تو دوسری ہی جانب 'غزلوں سے مہکتے چمن کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ 'حسن سخن' کالم میں صفیہ شمیم صاحبہ کی غزل 'بہار نو کی پھر سے ہے آمد' نے دل ہی جیت لیا چونکہ شاعری سے کچھ زیادہ ہی شغف رکھتی ہوں تو نظموں اور غزلوں کے کالم پر ہی پہلے توجہ رہی۔ تمام نظمیں ایک الگ ہی لطف دے رہی تھیں چاہے وہ 'قطرہ قطرہ' ہو یا 'اندیشہ'، 'سوچ' ہو یا 'حجاب' سب کو ہی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ وہاں سے نکل کر جب کہانیوں کی دنیا میں آئی تو ظاہر ہے انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ اپنی کہانی پر توجہ رہی لیکن پھر جب نصرت شمسی صاحبہ کی کہانی 'آدھے ادھورے'، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب صاحب کی 'اے جذبۂ دل گر میں چاہوں' اور زبیدہ معین الدین صاحبہ کی 'راضی' کو پڑھا تو ساری ہی کہانیاں زندگی کا کچھ نہ کچھ سبق دیتی نظر آئیں۔ اب جب باورچی خانہ کی طرف رخ کیا جو کہ ہم خواتین کے لیے سب سے اہم مقام ہوتا ہے تو لذیذ پکوان پکانے سے پہلے ہی منھ میں پانی بھر آیا۔ آم کا اچار، مرچ کا اچار، مکس اچار، سارے ہی اقسام کے اچار بنے ہیں اور الحمدللہ بنانے کی کوشش بھی کی ہے پر اس میں جب 'بینگن کے اچار' کی ریسیپی دیکھی تو عجیب لگا کیونکہ عموماً بینگن کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ یہ بیچارہ بے گن ہوتا ہے لیکن جب اس کے اچار کی ترکیب پڑھی تو اس کی اہمیت کا احساس ہوا اور اسی طرح سے دیگر بھی پکوان کی تراکیب بہت لذیذ معلوم ہوئی۔

صحت کا کالم بھی اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ تندرستی ایک بڑی نعمت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی اور یہ سچ ہے کہ تندرستی حقیقی دولت ہے اور ہمیں صحت کی فکر اس وقت ہوتی ہے جب ہم بیمار پڑ جاتے ہیں۔ 'خواتین دنیا' نے ہماری صحت کا بھی خیال رکھا اور ایک کالم ہمارے لیے 'صحت' کے نام سے اس میں شامل کیا ہے۔ اس شمارہ میں 'خون کا دباؤ (بلڈ پریشر)' کے نام سے مضمون شائع ہوا ہے۔ آج کل کے مسائل سے بھری اس دنیا میں جہاں یہ مرض ایک عام مرض ہوتا جا رہا ہے، اس مضمون سے ہمیں بلڈ پریشر سے متعلق بہت سی معلومات فراہم ہوتی ہے۔ خواتین کو خوبصورت نظر آنے کا شوق تو ہوتا ہی ہے اور خوبصورت نظر آنا کس کو پسند نہیں سجاوٹ اپنی ہو یا اپنے گھر کی اہم اور قابل توجہ ہوتی ہے۔ 'خواتین دنیا' نے اس کالم کو بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ رسالے کی زیبائش بنایا اور اس کا نام 'آرائش و زیبائش' رکھا جس میں اس دفع 'جلد کی دیکھ بھال' کے بہت ہی کارآمد نسخے سیکھنے کا موقع ملا۔ 'جہان نسواں' کالم کے مضامین نے بھی بہت اہم پہلوؤں مثلاً فکشن نگار خواتین کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی۔ اللہ تعالی سے دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ ترقی کے منازل طے کرتا ہوا ہمارے ملک اور قوم کے لیے مشعل راہ بنے آمین۔

سعدیہ سلیم شمسی، شعبۂ اردو، سینٹ جانس کالج، آگرہ (یو۔پی)

خواتین خبرنامہ

خواتین کو با اختیار بنانا اور تحفظ فراہم کرانا ہی حقیقی کامیابی

رامپور، 9 مارچ 2019، ہندوستان ایکسپریس (غفران فریدی)

بین الاقوامی خواتین کے موقع پر ہمارے ملک کی رہنما خواتین کو یکساں مواقع اور باوقار زندگی گزارنے کے خواتین کے حقوق کے دعوؤں کے ساتھ ہی ایک معاشرہ کے طور پر ان کے تحفظ کی ذمہ داری کا وعدہ تو کر رہے ہیں لیکن ملک کے موجودہ حالات اور ماحول اس کے خلاف کھڑے نظر

آرہے ہیں۔ یوم خواتین کے تعلق سے خود خواتین کیا سوچتی ہیں۔ ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی گئی تو متعدد افسانوی مجموعوں کی خالق اور اتر پردیش سرکار سے اعزاز یافتہ نصرت شمسی کا کہنا ہے کہ بے شک خواتین نے پوری دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے مگر کیا صرف چند خواتین کی کامیابی پر عالمی یوم خواتین کا جشن منانا تمام خواتین کے حق میں کافی ہے؟ جبکہ پوری دنیا میں آج بھی خواتین سب سے زیادہ مسائل سے دوچار ہیں۔ نصرت شمسی نے کہا کہ کہیں جہیز کے نام پر، کہیں ناخواندگی کے نام پر، تو کہیں گھریلو تشدد کے نام پر، تو کہیں غیر محفوظ معاشرہ اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ کیا ان مسائل سے نجات حاصل کیے بغیر عالمی یوم خواتین کا جشن منانا دل کی تسلی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کا سچا دن وہ ہوگا جب دنیا کی تمام خواتین گھر سے نکلتے وقت بے خوف ہوں۔ غیر محفوظ ہونے کا ڈر ان کے قدموں کی زنجیر نہ بنے۔ اسے اپنے تمام رشتوں میں خلوص اور انصاف ملے۔ ساتھ ہی ایک بھرپور زندگی جینے اور لکھنے، بولنے کا موقع حاصل ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو دنیا ترقی کے نام پر زوال پذیر ہوتی رہے گی کیونکہ عورت ہی معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ بقول علامہ اقبال 'وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'۔ معروف محقق اور مرادآباد مسلم کالج شعبہ اردو کی پروفیسر ڈاکٹر رباب انجم نے اپنے خیالات کچھ اس طرح بیان کیے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں خواتین کی دیوی کے طور پر پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے ساتھ غیر انسانی رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کی طرف بھی ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

حوصلے کی اڑان: ایمن فاطمہ

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھے جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

بقلم: ڈاکٹر مختار احمد فردین/حیدرآباد/کلکتہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور با مقصد زندگی کو بنانے اور جینے کے لیے آپ کو بہت کچھ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ خود اعتماد زندگی جینے والوں کی تاریخ دیکھ لیجیے، بچپن سے ہی وہ اپنا فیصلہ خود لیتے ہیں اور کرتے ہیں، ایسا ہی کچھ حوصلہ اور بلندی کو چھونے کی امید ایمن فاطمہ میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد فردین جو ایک سماجی جہد کار اور پیشے سے بنکرس ہیں اور دنیا کے بدلتے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں، ایمن فاطمہ ڈاکٹر مختار فردین کی بیٹی ہیں۔ ایمن فاطمہ ڈاکٹریٹ آف فارمیسی کی ہونہار

اور ذہین طالبہ ہیں۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاموں میں بھی خوب دلچسپی لیتی ہیں۔ پینٹنگ کرنا اور کہانی لکھنا ان کو بہت پسند ہے۔ وہ بچوں سے بیحد پیار کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد فردین کو ایمن فاطمہ سے ڈھیروں امیدیں ہیں۔

ایمن فاطمہ پڑھائی میں بہت محنت کرتی ہیں اور امتحان کے وقت خاص توجہ سے تمام سبجیکٹ کا گہرا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے نمبر ہمیشہ 90/80 فیصد رہے ہیں، ادھر انھوں نے چند سالوں میں اس کم عمری میں کئی ممالک کے دورے مثلاً امریکہ، یورپ، نیپال، سری لنکا اور کئی خصوصی لکچر اور اس سال Students of the year کا ایوارڈ انھوں نے حاصل کیا ہے۔ Deccan College آف فارمیسی کی طالبہ اور حیدر آباد کی نمائندگی کالج کے ساتھ ملک ہندوستان کا نام روشن کر کے آنا ہمارے لیے قابل فخر بات ہے۔

اسٹوڈنٹس آف لبرٹی میں ایمن فاطمہ نے اپنی محنت اور لگن سے چند برسوں میں ساؤتھ ایشیا کی چیئر ویمن اور ایز یکٹیو کی پوزیشن حاصل کر لی ہے، ایمن فاطمہ جب بھی خصوصی لکچر دیتی ہیں تو ان کی نگاہ دنیا کے تمام حالات پر ہوتی ہے جیسے غریبی، سیاسی تبدیلیاں، اسٹوڈنٹس رول، ایجوکیشن، ماحولیات، ویمنس امپاور منٹ وغیرہ۔ آج کی نسل میں اتنا شعور موجود ہے کہ آنے والے دنوں میں ممکن ہے کہ برابری اور انسانیت کے لیے پوری دنیا تعلیم یافتہ ملک بن جائے اور سنہرے دور کا آغاز ہو سکے۔ دنیا میں تبدیلی کی امیدیں آپ پلیٹ فارم آف اسٹوڈنٹس آف لبرٹی سے شعور بیداری مہم کے تحت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمن فاطمہ نے اس کم وقفے میں یوں تو کئی ایوارڈس حاصل کیے مگر سال 2018 برائے اسٹوڈنٹس آف دی ایئر ایوارڈ کے لیے 3 امیدوار میں ساؤتھ ایشیا سے ایمن فاطمہ، نارتھ امریکہ سے جسٹن انڈوشن،

یورپ سے لیا چینلیڈ زم تھیں۔ اس ایوارڈ کی 3 کیٹیگری تھی۔ اسٹوڈنٹس آف دی ایئر کیٹیگری کے لیے ایمن فاطمہ کے نام کا اعلان کیا گیا۔ دنیا کے ڈیلیگیٹس نے تالیوں کی گونج میں ایوارڈ کا اعلان کیا۔ پینل جیوری میں اسٹیو فاربس (Steve forbs) بھی وہاں موجود تھے۔ اسٹیو فاربس میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔ دنیا کی اتنی بڑی شخصیتوں کے درمیان ایمن فاطمہ کو اسٹیو فاربس نے خصوصی مبارک باد دیتے ہوئے اپنی نیک تمنائیں اور روشن مستقبل کی دعائیں دی۔ فاؤنڈر چیئر مین sloane frost کے ہاتھوں ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور تمام کیٹیگر یز کے ایوارڈ یافتگان نے ایمن فاطمہ کو مبارکباد دی۔

حیدر آباد اور ملک کی بھر پور نمائندگی کر کے یہ مقام حاصل کرنے والی ہونہار طالبہ ایمن کو اہل خاندان والوں نے بھی مبارک باد پیش کی خاص کر ڈاکٹر مختار احمد فردین نے امید ظاہر کی کہ آئندہ وہ اور بھی بہتر کام کریں۔ دنیا میں اپنی پہچان کچھ اس طرح سے بنائیں جو قابل فخر ہو۔ والدین، دوستوں اور کالج کے طالبات کے لیے اس کارگزاری کے بعد اب وہ سری لنکا کے دورے پر دنیا سے آئے مختلف ممالک کے اسٹوڈنٹس کو دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے مسائل پر خصوصی لکچر اور ٹریننگ دیں گی، حیدر آباد سے اس بار ٹیم کے ہمراہ محمد مصطفےٰ احمد بھی بہ حیثیت ایک ٹریننگ اور ایونٹ مینیجمنٹ کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔ طالبات کے لیے ایمن فاطمہ کا یہ اہم پیغام ہے کہ آپ اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے سوسائٹی اور سماج کے لیے اپنی خدمات دیں، یہ جذبہ طالب علموں میں بہت ضروری ہے تب ہی ملک اور ریاستیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گی۔ ایمن فاطمہ ایسے تمام طالب علموں کو جوڑنے کی فکر میں دن رات محنت کر رہی ہیں۔ ان کے روشن مستقبل کے لیے یہ قدم قابل مبارک باد ہے۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فکر وفن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 205

قیمت: 110 روپے

مقدمہ کلام آتش

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 134

قیمت: 90 روپے

حیدر جی کی کہہ مکرنیاں

مصنف: حیدر بیابانی

صفحات: 37

قیمت: 15 روپے

منی کے گیت

مصنف: محمد شفیع الدین نیر

صفحات: 50

قیمت: 20 روپے

چندا ماموں

مصنف: مظفر حنفی

صفحات: 21

قیمت: 30 روپے

راجندر منچند ابانی (مونوگراف)

مصنف: عمیر منظر

صفحات: 122

قیمت: 76 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

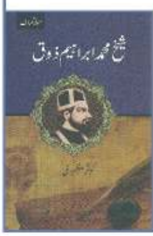

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 109

قیمت: 72 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

مصنف: عبید الرحمٰن ہاشمی

صفحات: 128

قیمت: 77 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2019, Vol. 03, Issue: 4
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025